مختلف مضامین

قرآنی سیریز ۵

علّامہ نصیر الدّین نصیر ہونزائی

کے ٹرانسکرائب لیکچرز

تمہید

استادِ بزرگوار علامہ صاحب قبلہ نے اپنی صد سالہ عمرِ گرانمایہ میں اپنی زبانِ فیض بار اور قلمِ جواہر نگار سے کتابوں کے علاوہ آڈیو لیکچرز کی صورت میں ایک بیش بہا خزانہ عالمِ انسانیت کے لئے عطا کیا ہے۔ اِن لیکچرز کی اہمیت کے حوالے سے آنجناب خود فرماتے ہیں:

''ہمارے کیسٹوں میں جو تقاریر ہیں وہ بنیادی اور اساسی مواد کا کام دیں گے، یعنی اُن سے اسماعیلی مذہب پر ریسرچ میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ میرے نزدیک ہر کیسٹ کا مواد ایک کتابچہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں بڑی اہم باتیں ریکارڈ ہوئی ہیں۔ کیسٹوں کے قیمتی مواد کو محفوظ کر لینا ضروری ہے، کیونکہ یہ ہماری پیاری جمعیت کی دولت ہے، یہ ہمارے علمی سرمایے کا ایک اہم حصّہ ہے، اور ہم کو یقین ہے کہ مستقبل میں ہمارے ان علمی کاموں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہونے والا ہے، ہماری تحریروں کے ایک ایک پُرزے پر ریسرچ ہوگی، کیونکہ ہماری نگارشات میں امامِ عالیمقامؑ کی نورانیت و روحانیت براہِ راست کارفرما ہے''۔ (غیر مطبوعہ)

استادِ گرامی قبلہ کی اِس روشن ہدایت کے پیشِ نظر اِن گرانمایہ دُرّ و مرجان کو ضبطِ تحریر میں لانے کا انتہائی اہم اور دقیق کام استاد بحر العلوم صاحب کی سرپرستی میں شروع کیا گیا ہے۔ اور آپ نے اِس سلسلے میں خانۂ حکمت کے تمام سینٹرز میں جا کر اس کام کی اہمیت کے حوالے سے آگاہی اور رہنمائی فرمائی ہے اور ناچیز کو اِن لیکچرز کو تحریر میں لانے اور منظم کرنے کی ذمہ داری دی ہے اس سلسلے میں کئی احباب انتہائی جانفشانی سے کام کر رہے ہیں۔ ان خزائن کو جماعت اور دنیائے انسانیت تک پہنچانے کے لئے محترم مصطفیٰ مومن صاحب نے اسے (ebook) کی صورت میں پیش کرنے میں ہماری مدد فرمائی ہے۔

ناچیز نسرین اکبر

قرآنی سیریز ۔ ۵

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	لیکچر نمبر	صفحہ نمبر
۱	سورۂ بقرہ آیت نمبر ۲۵۹ کی تاویل	ق- ۴۱	۱
۲	کتاب ثبوتِ امامت میں دیئے گئے دلائل کی وضاحت	ق- ۴۲	۱۸
۳	سورۂ یاسین کا خلاصہ (پاک ہے وہ ذات جس نے تمام چیزوں کو جوڑے میں پیدا کیا)	ق- ۴۳	۲۴
۴	سورۂ حدید	ق- ۴۴	۳۶
۵	سورۂ بلد	ق- ۴۵	۴۸
۶	سورۂ ص	ق- ۴۶ الف	۶۰
۷	سورۂ ص	ق- ۴۶ ب	۷۱
۸	سورۂ صافات کی تاویل	ق- ۴۷	۸۰
۹	قرآنِ حکیم میں تصورِ وراثت	ق- ۴۸	۹۵
۱۰	سورۂ نجم آیت ۱ تا ۲۰ تک کی حکمتیں	ق- ۴۹	۱۰۷
۱۱	سورۂ ماعون کی تاویل (کتاب: سوغاتِ دانش ص ۷۳)	ق- ۵۰	۱۱۵

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیر ہونزائی ق س کا پرحکمت بیان

سورۂ بقرہ آیت نمبر ۲۵۹ کی تاویل

Click here for Audio

کیسٹ نمبر کیو ۴۱۔ تاریخ ۱۷ نومبر ۱۹۸۳ء

یا علی مدد

ہمیں کچھ دن ہوئے ایک بہت بڑی جگہ سے ایک حکم ملا ہے، ایک فرمائش آئی ہے، اور اس میں ایک بہت ہی شاندار اور عظیم تاویل کے لئے فرمائش کی گئی ہے، اور میرے خیال میں اور ان عظیم دوستوں کے خیال میں یہ بہت ہی اہم سوال ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوال یا کہ اس کا جواب کسی کتاب میں اتفاق سے نہیں ہے یا کسی طرح سے بھی تو اسی بندۂ عاجز نے کوشش کی ہے کہ اس سلسلے میں کچھ مفید باتوں کا انکشاف کیا جائے اور آپ بھی دعا کریں کہ ہم اس جواب کے مہیا کرنے میں کامیاب ہوجائیں اور میں اس آیت کو جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے، آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اور اس کا ظاہری ترجمہ اور پھر اس کے بعد تاویل کے لئے کوشش کی جاتی ہے تاکہ ہمارے اس کام میں آپ کی اس محفل کی بدولت برکت پیدا ہوجائے اور مولا کسی طرح سے تائید و نصرت عطا فرمائے، وہ آیت سورۂ بقرہ کی نمبر ۲۵۹ کی ہے جو آپ کے سامنے پڑھی جاتی ہے اور اس کا ظاہری ترجمہ کیا جاتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَوۡ کَالَّذِیۡ مَرَّ عَلٰی قَرۡیَۃٍ وَّ ہِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوۡشِہَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحۡیٖ ہٰذِہِ اللّٰہُ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ۚ فَاَمَاتَہُ اللّٰہُ مِائَۃَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَہٗ ؕ قَالَ کَمۡ لَبِثۡتَ ؕ قَالَ لَبِثۡتُ یَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ یَوۡمٍ ؕ قَالَ بَلۡ لَّبِثۡتَ مِائَۃَ عَامٍ فَانۡظُرۡ اِلٰی طَعَامِکَ وَ شَرَابِکَ لَمۡ یَتَسَنَّہۡ ۚ وَ انۡظُرۡ اِلٰی حِمَارِکَ وَ لِنَجۡعَلَکَ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ وَ انۡظُرۡ اِلَی الۡعِظَامِ کَیۡفَ نُنۡشِزُہَا ثُمَّ نَکۡسُوۡہَا لَحۡمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗ قَالَ اَعۡلَمُ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (۲:۲۵۹)

خداوند عالم کا ارشاد ہے: یا اس شخص کی طرح جو ایک گاؤں پر گزر گیا اور وہ گاؤں اپنی چھتوں پر گر گیا تھا یعنی خداوند عالم ایک قصے کو ایک واقعے کو بیان کرنا چاہتا ہے، اور وہ قصہ یوں ہے کہ ایک شخص تھا، کوئی

عظیم شخص وہ کہیں سفر پر جا رہا تھا تو ایک ایسے گاؤں سے دوچار ہوگیا، ایک ایسے گاؤں سے اس کا گزر ہوا کہ وہ گاؤں تباہ ہوگیا تھا، ویران ہوگیا تھا تو اس شخص نے کہا کہ یہ جو کہا جاتا ہے اور مانا جاتا ہے کہ خداوند عالم مردوں کو جلاتا ہے تو اس گاؤں کو اور اس گاؤں کے لوگوں کو ان کے مرنے کے بعد کس طرح اللہ تعالیٰ جلائے گا؟ یعنی زندہ کرے گا؟ یوں کہنے کے ساتھ ساتھ خداوند عالم نے اس شخص کو سو برس تک موت کی نیند سلا دیا، اور اس کے بعد اسے زندہ کردیا پھر خدا نے اس شخص سے پوچھا کہ تو اس موت میں کتنی دیر تک رہا؟ اس نے کہا: میں ایک دن رہا ہوں گا یا اس سے بھی کم، اس پر خدا نے فرمایا بلکہ تو سو برس تک اس موت کی نیند سویے رہا، پس دیکھ لے اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف جو اس وقت تمہارے ساتھ تھیں، اور اب بھی یہ چیزیں تازہ ہیں جو سڑی نہیں ہیں، اور دیکھ تیرا گدھا جو اس وقت تیرے ساتھ تھا، وہ بھی زندہ ہوکر تیرے سامنے ہے، اور میں نے یہ معجزہ اس لئے کیا تا کہ تجھ کو لوگوں کے لئے ایک نمونہ قراردوں، اور دیکھ ہڈیوں کی طرح کہ کس طرح ہم نے ان کو جوڑ دیا ہے، اور ان پر کیسے گوشت چڑھایا ہے، جب اس پر یہ ساری باتیں ظاہر ہوئیں تو اس نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

یہ اس آیۂ کریمہ کا ظاہری ترجمہ ہے، اب اس کی تاویل آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے، آپ دیکھئے گا کہ تنزیل اور تاویل میں کتنا فرق ہے، اور تاویل میں کتنی لذت ہے اور کس طرح خداوند عالم مختلف مثالوں میں علم وحکمت کی باتوں کو پوشیدہ رکھتا ہے تو آپ کو اس کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا۔

سب سے پہلے ہمیں گاؤں کی تاویل بتانی چاہیے تو قرآن مقدس میں جہاں کہیں بھی گاؤں کا ذکر آیا ہے اس سے ذاتی دنیا مراد ہے یعنی جس طرح ہر انسان اپنی ذات میں ایک دنیا ہے، ایک عظیم شہر ہے، ایک بہت بڑی آبادی ہے، اس کی مثال گاؤں سے دی گئی ہے، ویسے تو قانون قرآن کے مطابق مثالیں ہر وقت بدلتی رہتی ہیں، کسی بھی حقیقت کو خداوند عالم مختلف مثالوں سے پیش کرتا ہے، اسی طرح ان بہت سی مثالوں میں سے ایک مثال یہ بھی ہے کہ انسان کے باطن میں جو ایک دنیا ہے جس کو عالم صغیر کہا جاتا ہے، اور شخصی دنیا بھی کہا جاتا ہے، اور ہم نے اس پر عالم شخصی کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھا ہے[1] تو یہ عالم صغیر یا کہ عالم شخصی کا نام یہاں اس آیت میں اور دوسری کئی آیات میں قریہ ہے گاؤں، ویسے لفظی طور پر قریہ عربی میں گاؤں کو

---

[1] عالم شخصی: علم کی سیڑھی، ص۹۷، عملی تصوّف اور روحانی سائنس و روحانی سائنس کے عجائب وغرائب، ص۶۰، ہزار حکمت، حکمت نمبر۲۵۷، کتاب العلاج، علمی علاج، ص۱۱۰، معرفت کے موتی حصّۂ دوم، ص۳۱، قرآنی سائنس حصّۂ اوّل، ص۱۸، لعل وگوہر، ص۸۶، ۱۰۴، س، چراغِ روشن اور حکیم پیر ناصر خسرو ایک علمی کائنات ص۹۷، صنادیق جواہر، سوال نمبر۲، ۹۵، ۹۶، ۱۱۷، ۲۴۸، ۴۷۶، ۵۵۹، ۵۶۳، ۵۹۷، ۶۲۸، ۶۶۱، ۷۸۱، ۷۸۲، ۸۲۱، ۸۷۰، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۹۴۔

کہتے ہیں لیکن اس گاؤں سے انسان کے اندر جو ایک انفرادی/ذاتی دنیا پوشیدہ ہے اس کا نام، اس کی مثال قریہ یعنی گاؤں سے دی گئی ہے، اور اب یہ جو کہا گیا کہ اس شخص کی طرح جو ایک بستی سے یا ایک گاؤں سے گزرا اور وہ گاؤں اپنی چھتوں پر گر گیا تھا یعنی تباہ ہو گیا تھا۔

اس کا تاویلی خلاصہ یہ ہے کہ وہ شخص کوئی معمولی شخص نہیں تھا، پیغمبری یا امامت کے درجے کی کوئی ہستی تھی، اور اس گاؤں سے گزرنے کا مطلب وہ روحانی طور پر گزر گیا ظاہری طور پر نہیں، یہ کوئی ظاہری سفر نہیں تھا، بالکل باطنی اور روحانی سفر تھا، اور یہ ایک ایسے گاؤں سے گزر گیا اور وہ گاؤں اپنی ذات کا گاؤں تھا، اور اپنے باطن کی بستی تھی یعنی personal world یا کہ عالم شخصی پر گزر گیا، اور اس نے دیکھا کہ وہ گاؤں زیر و زبر ہو چکا تھا، تہہ و بالا ہو چکا تھا تو یہ code language میں خداوند عالم ارشاد فرمانا چاہتا ہے کہ جب کوئی کامل مومن یا حقیقی مومن یا اس سے اوپر کے درجے کا کوئی کامل انسان جب روحانی سفر پر چلتا رہتا ہے تو ایک مرحلہ وہ بھی آتا ہے جس میں کہ جبرائیلؑ، میکائیلؑ، اسرافیلؑ اور پھر عزرائیل آتے ہیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں اور ہم نے کسی article میں لکھا بھی تھا کہ کسی عمارت کو عمارت کو گرانے کے دو مقصد ہوتے ہیں، یا اس کو بالکل ہٹانا اور ختم کرنا مقصود ہوتا ہے یا نئے سرے سے اس کو تعمیر کرنا ہوتا ہے، ان دو مقاصد میں سے ایک مقصد ضرور ہوتا ہے، چنانچہ انسان جو اپنی ازلی اور اصلی صلاحتیوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، وہ اس دنیا میں آنے کی وجہ سے اور عرصے تک اس دنیا میں رہنے کی وجہ سے ان تمام صلاحیتوں کو یا ان تمام خوبیوں کو کھو بیٹھتا ہے، اور اس کی مثال یوں ہوتی ہے کہ کسی عمارت کو یا کسی بستی کو گرا کر نئے سرے سے اس کی تعمیر کی جائے، چنانچہ جب جبرائیلؑ، میکائیلؑ، اسرافیلؑ اور عزرائیلؑ آتے ہیں روحانی ترقی کے نتیجے میں اسم اعظم، بول، عبادت، فرمانبرداری اور سب سے بڑھ کر امامؑ کی مہربانی اور اس کی عنایت کے بدولت جب یہ مرحلہ آتا ہے تو خدا کے حکم سے اس بستی کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کے لئے اس کو زیر و زبر کر دیا جاتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اس میں اور بھی حکمتیں ہیں، مثلاً یہ دکھانا ہوتا ہے کہ موت کیا ہے؟ جبرائیلؑ کا کام کیا ہے، میکائیلؑ کا کام کیا ہے، اور اسرافیلؑ کیا کرتا ہے اور عزرائیلؑ کس طرح روحوں کو قبض کرتا ہے، یہ مظاہرہ یا demonstration بھی مقصود ہوتا ہے، لہٰذا بہر حکمت اور بہر طور اس قریہ کو یا اس گاؤں کو ایک بار برباد کر کے نئے سرے سے اس کی تعمیر ہوتی ہے تو اس آیت میں اس روحانی واقعے کا ذکر فرمایا گیا ہے، اور وہ جو شخص ہے جو اس گاؤں پر گزرا کوئی پیغمبر، کوئی امام، کوئی کامل انسان تھا۔

یہاں پر جو فرمایا گیا ہے کہ اس شخص نے کہا کہ خداوند تعالیٰ کیسے اس بستی کو نئے سرے سے زندہ کرے گا؟ یہ تو زبانِ حکمت ہے، اس نے اظہار تعجب کیا ہوگا، اور مرکر دوبارہ زندہ ہوجانے کا تقاضا کیا ہوگا لیکن خداوند عالم اس عظیم حکمت پر لفظوں کا ایک پردہ بنانا چاہتا ہے، حجاب بنانا چاہتا ہے کیونکہ خدا کی سنّت میں یہ بات آتی ہے کہ وہ ہر عمدہ چیز پر ایک حجاب ایک پردہ کو رکھتا ہے، اور سب سے پہلے خدا نے اپنی ذات کے لئے حجاب کو پسند کیا، جیسے ذکر آتا ہے وحی کے سلسلے میں کہ خداوند عالم کی طرف سے کسی بشر کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ آمنے سامنے خدا سے ہم کلام ہوجائے مگر یہ ہے کہ خدا جب بھی کسی سے کلام کرنا چاہے گا تو حجاب کے پیچھے سے، پردے کے پیچھے سے کلام فرمائے گا،[1] اس قانون کے مطابق خدا نے اپنے بڑے بڑے بھیدوں کے اوپر بھی پردے بنائے، حجاب میں رکھا، چنانچہ یہاں روحانیت کی باتیں ہیں، اس لئے خدا نے کچھ الفاظ ایسے استعمال کئے اور عبارت کو ایسی بنایا کہ وہ ان روحانی بھیدوں کے لئے پردہ اور حجاب بن جائے، سو اس عظیم شخص نے گویا ظاہری عبارت کے مطابق یہ کہا کہ خداوند عالم اس بستی کو دوبارہ کس طرح اور کیونکر زندہ کرے گا، یہ خیال اس کے دل میں آیا، کس طرح سے؟ چونکہ یہ تو کوئی کفر کی بات نہیں ہے، یہ معجزے کو طلب کرنے کی بات ہے، کیونکہ کوئی ایسی بات دو قسم کی ہوتی ہے، ایک تو انکار کے طور پر ایسی بات ہوتی ہے، اور دوسری بات معجزے کو طلب کرنے کے لئے یوں بات ہوتی ہے تو اسی آیت کے قریب ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے بھی خدا سے یہ درخواست کی تھی کہ بارِ الٰہی مجھے دکھا دے کہ تو کس طرح مردے کو زندہ کرتا ہے؟[2] تو ابراہیمؑ کی یہ خواہش اور اس شخص کی یہ خواہش دونوں ایک جیسی ہیں، ان دونوں حضرات نے اپنی ذات میں یہ دیکھنا چاہا تھا کہ کس طرح کسی مردے کو زندہ کیا جاتا ہے تو اس شخص نے جب یہ کہا تو خداوند عالم نے اس کو سو برس تک موت کی نیند سلا دیا، اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ آیا خدا نے اس شخص کو عالم ظاہر میں اس مادی دنیا میں اور جسمانی طور پر اتنے لمبے عرصے کے لئے مردہ رکھا؟ نہیں، تو خدا کے نزدیک جس موت کا ذکر آتا ہے وہ بہت ہی پرحکمت موت ہے، آپ کو کبھی یاد ہوگا کہ ہم نے سورۂ رحمٰن میں سے فنا کا ذکر کیا تھا،[3] اور میں نے آپ سے گزارش کی تھی کہ اس فنا میں بہت بڑی حکمت ہے کیونکہ فنا کے بعد خداوند عالم اپنی نعمت کا ذکر فرماتا ہے، لہٰذا اس فنا میں بھی نعمت ہے، بالکل اسی طرح سے خداوند عالم نے اس شخص کو جس موت کی

---

[1] ۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۚ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (۴۲:۵۱)

[2] ۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۖ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۖ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (۲:۲۶۰)

[3] ۔ علمی خزانہ، پنج مقالہ نمبر ۵، ص ۲۵۲۔

نیند سلا دیا، وہ موت روحانیت تھی، روحانیت جس کا آپ ہم ہمیشہ ذکر کرتے رہتے ہیں، اسی کو موت کیا گیا ہے، کیوں؟ روحانیت کیسے موت ہوسکتی ہے؟ ہاں! جب جبرائیلؑ، میکائیلؑ، اسرافیلؑ کے ساتھ عزرائیلؑ بھی آتا ہے، اور عزرائیلؑ جان کو قبض کرتا ہے، روح کو قبض کرتا ہے تو آپ ہم یا اور کوئی اسے کیا کہیں گے؟ موت لیکن پرحکمت موت جس کو خدا نے حکمتوں سے بھرپور بنایا ہے، جب عزرائیلؑ آتا ہے اور جان لینے کے مظاہرے کرتا ہے یا demonstrations کرتا ہے، اور اس کے لئے تقریباً ایک ہفتہ لگتا ہے تو پھر اسے آپ کیا کہیں گے؟ موت۔

اب رہا سوال کہ "سو برس تک" اس کے کیا معنی؟ سو برس کے معنی، یہ ظاہری سال نہیں ہے، یہ مبسوط روحانیت ہے یعنی اس کو کس طرح ہم سمجھیں گے؟ یعنی اس کو روحانیت کو extension دیا گیا ہے، extension دینے کا کیا مطلب ہے؟ دیکھیں! سورۂ فاتحہ کو اگر مرتضیٰ علیؑ extension دے، اس کی تفسیر لکھے تو ان تفاسیر کا وزن ساٹھ اونٹوں پر ہوگا ایک روایت کے مطابق،[1] اب ہم ظاہر میں سورۂ فاتحہ کو دیکھتے ہیں، یہ اتنی لمبی چیز نہیں ہے کہ ساٹھ اونٹوں پر اس کی تفسیروں کا بوجھ ہوجائے، ایک صفحہ ہے زیادہ سے زیادہ، اور وہ بھی پورا نہیں سات آیتیں ہیں، اسی طرح روحانیت کا وہ حصّہ جو منزل عزرائیلؑ سے لیکر نفس کلی کے مقام تک پہنچتی ہے، اس کو موت کہا جاتا ہے، اس کے اوپر جو روحانیت ہے، اس کو حیات کہا جاتا ہے، مطلب اس کا یہ ہوا کہ روحانیت کے دو بڑے حصّے ہیں، ایک حصّے کی تشبیہ موت سے دی گئی ہے یا یہ کہ وہ موت ہے، نفسانی موت کہیے یا روحانی موت کہیے، اور دوسرے حصّے کو حیات/زندگی کہا جاتا ہے۔

اب اس تذکرے میں آپ کو بہت مزہ آئے گا کہ جب موت ہی ایسی رنگین ہے، ایسی پیاری ہے جس کے لئے مومنین تڑپتے ہیں تو پھر اس سلسلے کی جو حیات ہوگی وہ کس قدر اعلیٰ ہوگی؟ اور کتنی پرحکمت ہوگی؟ اور خدا نے اس کو کس طرح حکمتوں سے اور رحمتوں سے بھرپور بنایا ہوگا؟

یہ سوچنے کی بات ہے، ہاں اس روحانیت کو جو عزرائیلؑ کے stage سے لیکر نفس کلی تک پھیلی ہوئی ہے، اس کو موت کہا گیا ہے، اور سو برس کا مطلب یہ ہے کہ سو کا figure فارمولے کا figure ہے، جس طرح آپ نے وجہ دین میں یا کسی اور تاویلی کتاب میں دیکھا ہوگا کہ ایک کا figure مستجیب کے لئے ہے، جو نیا یا پرانا مرید دعوت کو جس نے قبول کیا ہے اس کو مستجیب کہتے ہیں، اور دو کا عدد چھوٹے ماذون کے لئے ہے،

---

[1] مولا علی علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر لکھ دوں کو ستر اونٹ لاد دوں گا۔

تین کا عدد بڑے ماذون کے لئے ہے، چار کا figure چھوٹے داعی کے لئے ہے، اور پانچ کا figure بڑے داعی کے لئے ہے، اور چھ کا figure وہ باہر کے یعنی جزیرے کے داعی کے لئے ہے اور سات کا figure وہ حجت مقرب کے لئے ہے، آٹھ کا عدد امامؑ کے لئے ہے، اور نو کا عدد اساس کے لئے ہے، دس کا عدد ناطق کے لئے ہے، اور سو کا عدد نفس کلی کے لئے ہے، اور ہزار کا عدد عقل کلی کے لئے ہے تو جہاں کہیں بھی قرآن کی حکمت میں کوئی ہندسہ، کوئی figure آتا ہے تو اس میں دیکھنا ہوتا ہے اچھی طرح سے کہ آیا اس فارمولے کے مطابق اس عدد سے یہ مراد ہے یا اور کوئی بات بھی ہوسکتی ہے، اس میں دیکھنا ہوتا ہے۔

یہاں سو برس تک اس عظیم شخص کے مرے رہنے کی تاویل یہ ہے کہ اس نے روحانیت کے تمام مراحل کو طے کیا اور نفس کلی تک پہنچا۔

اور اب دیکھئے دوسری طرف سے خدا نے اپنا code word استعمال کیا اس روحانیت کو موت کہا، موت کے لفظ سے ایک پردہ بنایا، ایک حجاب بنایا اور اس کے تحت ایک عظیم حکمت کو پوشیدہ رکھا تا کہ لوگوں کو جو اس کے اہل نہیں ہیں، جو اس حکمت کے حقدار نہیں ہیں، ان کو اس کا گمان نہیں ہو کہ یہاں کوئی تاویلی خزانہ ہے، اور دوسری طرف سے ایک لحاظ سے یہ صحیح بھی ہے کہ جہاں روحانیت ایک کامل زندگی ہے تو اس کامل زندگی میں موت بھی ہونی چاہیے، اور حیات بھی ہونی چاہیے، جس طرح عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد زندہ ہو جانا ہے تو اس سلسلے میں موت پہلے آنی چاہیے، جو حقیقی حیات ہے وہ بعد میں آنی چاہیے تو یہ بات بھی صحیح ہے تو یہ جو عظیم شخص تھا، جو پیغمبری کے درجے کا تھا یا کوئی امام یا حدودِ دین میں سے کوئی عظیم انسان تھا، وہ اس روحانیت میں ان تمام مراحل میں سے گزرتا رہا۔

اس کے بعد خداوند عالم نے اس کو زندہ کیا، اب دیکھیں زندہ تو تھا ہماری چھوٹی عقل کے مطابق اس میں شعور تھا، روحانیت کے تجربات کرتے تھے اور سب چیزیں دیکھتے تھے وغیرہ لیکن پھر زندہ کرنے کے کیا معنی؟ زندہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ نفس کلی سے آگے بڑھایا اس کو اور مقام عقل تک پہنچایا، اور وہاں پر جو دین کے عظیم بھید ہیں اور وحدانیت کے عظیم اسرار ہیں اُن سے اس کو آگاہ کیا، کیا ہوا؟ اس نے باقی دوسرے demonstrations دیکھے تھے جو اس کے نیچے ہوتے ہیں اس کے بعد اب جو اس نے demonstration دیکھا وہ بڑا عجیب تھا، وہ عقل کلی کے مظاہرے تھے جس میں سارے اسرار، سارے بھید معرفت کے خدا شناسی کے، دین کے، علم کے، ازل کے، ابد کے اور خدا کی خدائی کے سارے بھید (یعنی بھیدوں کا) اس نے

مشاہدہ کیا، پھر اس نے اپنے آپ کو مبدَع میں زندہ پایا، وہاں پر جو زندگی ہوتی ہے وہ بکھری ہوئی زندگی نہیں ہوتی ہے، مثلاً ہم سب اگر روحانی موت سے مرجائیں جتنے یہاں ہیں، اور اگر ہم کو زندہ کیا جائے تو ہماری کثرت وہاں پر ختم ہوجائے گی، ہم زندہ ہوجائیں گے مگر ایک ہوکے زندہ ہوجائیں گے، ہم کیا اور ہماری تعداد کیا اگر دنیا بھر کے لوگوں کو خدا مار کر حقیقی معنوں میں زندہ کرے تو وہ ایک فرد کی حیثیت میں زندہ ہوجائیں گے کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ تم میرے پاس ایک ایک ہوکے آؤ گے،[1] ایک ایک ہوکے آؤ گے، "تم میرے پاس ایک ایک ہوکے آؤ گے" یہ سب سے اونچی منزل کا ذکر ہے تو اس عظیم شخص نے اپنے آپ کو امرِ کن کے تحت لطیف جسم میں خود کو دیکھا یا کہ یوں کہا جائے کہ اس نے مبدَع جس درجے کا نام ہے اس میں خود کو پایا، اور وہ اس وقت ان تمام باتوں کو تاویلی طور پر نہیں سمجھتے تھے تاہم اس معجزہ کو دیکھا کہ اس نے مبدَع کا دیدار کیا، اور اس میں اس کی ہستی تھی، جس طرح ہم کہتے ہیں "انائے علوی" تو اس نے اپنی انائے علوی اس میں پایا، اور ایک بہت ہی بلند ترین مقام پر یا ایک انتہائی اونچے درجے میں اس نے اپنی خودی کو پایا پھر خدا نے اس سے پوچھا زبانِ حال سے یا زبان قال سے کہ تو کتنی دیر تک اس موت میں رہا؟ تو اس نے عرض کیا کہ میں ایک دن یا اس سے بھی کم رہا ہوں گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنے روحانیت کے معجزات ہوتے ہیں اس وقت ان کی تاویل نہیں آتی ہے اور وہ سارے معجزات اور وہ سارے بھید عجیب لگتے ہیں، اور کچھ خاص بات بنیاد سے، گہرائی سے سمجھ میں نہیں آتی ہے کیونکہ اصول یہ ہے کہ روحانیت کچھ اس طرح سے واقع ہوجاتی ہے کہ اس کی شکل وصورت تنزیل کی سی ہوتی ہے یا وہ تنزیل ہی ہے یعنی تاویل اس کے ساتھ ایک دم سے نہیں آتی ہے، اور اس کے بعد رفتہ رفتہ ان واقعات کی تاویل بعد میں آتی ہے، جس طرح امت کے لئے اور مومنین کے لئے آنحضرت کے توسط سے قرآن نازل ہوا تھا، اور اس میں صرف تنزیلی صورت تھی مگر تاویل کے لئے ایک وقت، ایک لمبا عرصہ، ایک زمانہ درکار تھا کیونکہ تاویل دنیا کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ، انقلابات کے ساتھ ساتھ اور ضرورت کے ساتھ ساتھ تاویل آتی ہے، اور تنزیل کا عرصہ بہت کم ہوتا ہے اور تاویل کا عرصہ بہت لمبا ہوتا ہے۔

اس شخص نے عرض کیا کہ وہ ایک دن یا اس سے بھی کچھ کم دن اس موت میں رہا ہوگا، اس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے تنزیل کو لیا لیکن خدا نے فرمایا کہ دیکھو کہ تم سو برس تک اس میں رہے ہو تو اس میں مراد یہ تھی

---

[1] ۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی (۶:۹۴)

کہ خدا نے extension کو لیا، اس روحانیت کو مبسوط طریقے سے، اس کی وضاحت کے ساتھ، اس کی تفسیر کے ساتھ اور اس کی تاویل کے ساتھ خدا نے اس کو سامنے رکھا۔

یہاں پر اور ذرا زیادہ مرکر زندہ ہوجانے کے سلسلے میں وضاحت کرنے کی ضرورت ہے، اس مقام پر وہ زندہ ہوا، اور زندہ ہونے کا مقام مقامِ عقل تھا، اور ابداع تھا، اور کلمۂ کن کا مقام تھا، اور جثۂ ابداعیہ کا مقام تھا، انہی مقامات پر اس کو ایک حقیقی زندگی عطا کی گئی، پھر اس سے فرمایا گیا کہ تو اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھ کہ یہ چیزیں سڑی ہوئی نہیں ہیں، ہرگز سڑتی نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مقام ایسا تھا کہ جس پر اس نے تمام مادی غذاؤں پر خوشبوؤں کی صورت میں محسوس کیا، اس نے اپنی سابقہ زندگی میں جو کچھ کھایا تھا، جو کچھ پیا تھا، اور جو کچھ سونگھا تھا، پھلوں میں سے، غذاؤں میں سے، اور پینے کی چیزوں میں سے، ان تمام (چیزوں) کو اس نے خوشبوؤں کی صورت میں، energies میں پایا، اس لئے خدا نے فرمایا کہ دیکھو تم اپنی ان چیزوں کو جو کھانے سے متعلق ہیں کہ وہ ابھی سڑی نہیں ہیں تو ان لطیف یا کہ جلالی غذاؤں کو اس نے خوشبوؤں کی شکل میں محسوس کیا پھر اسے یقین آیا کہ بہشت کی لطیف غذائیں ایسی بھی ہوتی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ خداوند عالم نے فرمایا کہ دیکھ تو اپنے حمار کی طرف یعنی گدھے کی طرف، اس گدھے سے کیا مراد؟ آیا واقعاً وہ گدھا وہاں پر ایک جانور کی حیثیت میں تھا؟ نہیں، تاویل کہتی ہے، قانونِ تاویل کہ یہ بھی ایک code word ہے کہ خداوند عالم نے اس طرح سے اپنے اس جسم خاکی کو، انسان کی جسم خاکی کو سامنے لانا چاہا، اور چونکہ اس وقت وہ اس جسم میں تھا، اور اسی جسم میں اس نے یہ روحانیت حاصل کی تھی اور اپنے جثۂ ابداعیہ کو ایک اضافی زندگی کے طور پر ایک اضافی وجود کے طور پر پایا تھا، لہٰذا یہ ضروری تھا کہ وہاں پر جسم کا بھی تذکرہ ہو تو خداوند عالم نے اس جسم کی تشبیہ ایک گدھے سے دی، اس میں کئی اسباب ہیں کہ کیوں خدا نے جسم کی تشبیہ ایک گدھے سے دی؟ ایک تو جسم کی تشبیہ گدھے سے دینے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ جس طرح گدھا ایک سواری کا جانور ہے یا جس پر بوجھ لادا جاتا ہے جو انسان کے کام میں لگایا جاتا ہے، اس طرح اصل زندگی کے مقابلے میں اور اصل ہستی کے سامنے یہ جسم گدھے سے بڑھ کر نہیں ہے، اس کے علاوہ بعض حیوانی قسم کی صلاحیتوں کی طرف بھی یہاں اشارہ ہے، بہرحال اس وقت جسم بھی بدلا ہوا ہوتا ہے تو خداوند عالم نے اس عظیم انسان کو جسم کی طرف بھی توجہ دلائی اور اگر ہم کہیں تو یہ صحیح ہوگا کہ ایک طرح سے یہ جسم بھی مرکر دوبارہ زندہ ہوگیا تھا کیونکہ روح پر جو کچھ گزرتا ہے سو جسم اس کے زیر اثر ہو جاتا ہے، جسم چونکہ ایک جانور کی

طرح ہونے کے باوجود روح کا ہمسایہ ہے تو اس کی اصلاح ہوجاتی ہے اور اس کی بعض خرابیاں ختم ہوجاتی ہیں اور بعض صلاحیتیں اس میں اجاگر ہوجاتی ہیں۔

(کیو۔۱۴ بی) ۔۔۔ یہ کہ اس سے عوام النّاس مراد ہوں گے، یہاں پر ذرا سوچنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے عوام مراد نہیں ہیں، کیونکہ عوام کو ان معجزات سے کیا فائدہ؟ اللہ کا یہ فرمانا کہ میں تجھ کو لوگوں کے لئے ایک نشانی بنانا چاہتا ہوں تو اس سے حقیقی لوگ جن کو صحیح معنوں میں انسان کہنا چاہیے وہ لوگ مراد ہیں، اور اہل روحانیت ہیں، جن کو ان قصّوں سے اور ان مثالوں فائدہ ہے، اور اس میں علم وحکمت اور تاویلی بھیدوں کا فائدہ ہے، اس لئے خدا نے فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کیلئے ایک نشانی بنانا چاہتا ہوں۔

پھر خدا نے ارشاد فرمایا کہ دیکھ ہڈیوں کی طرف کہ ہم ان کو کس طرح ترتیب دیتے ہیں۔ ہڈیوں سے یہاں کیا مراد ہے؟ ہڈیوں سے ذراتِ لطیف مراد ہیں، ذرّات لطیف کا ہم بار بار ذکر کرتے ہیں، ذرّات لطیف کے مطلق ہم نے بہت کچھ کہا ہے،[1] یہاں ذرّات لطیف کی طرف توجہ دلانے کا مقصد یہ ہے کہ جب بھی جسم لطیف کا کوئی وجود بنتا ہے تو انہی ذرّات لطیف سے یہ compound ہو جاتا ہے، اس لئے قرآن میں مرکر دوبارہ زندہ ہوجانے کے سلسلے میں ہڈیوں کا ذکر آتا ہے، خون کا رگوں کا کبھی ذکر نہیں آیا، خداوند عالم نے فرمایا کہ دیکھو ہڈیوں کی طرف کہ ہم نے کس طرح ان کو ترتیب دی ہے، اس سے مراد ذرّات لطیف ہیں کہ انہی کے یکجا ہونے جانے سے لطیف جسم وجود میں آتا ہے کن کے ساتھ آناً فاناً، پھر فرمایا کہ دیکھو کہ کس طرح ہم نے ان کے اوپر گوشت چڑھایا ہے۔ یہاں گوشت کا مطلب یہ گوشت نہیں جو اس جسم کے ساتھ ہے مگر اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ وہ جو ابداعی ہستی سامنے آتی ہے جسے فلکی جسم بھی کہا جاتا ہے تو وہ ہستی جو مبدَع ہے، وہ بالکل ایک تندرست اور انتہائی شکیل انسان کی طرح ہوتا ہے حالانکہ وہ گوشت پوست کا نہیں ہوتا ہے، گوشت پوست کا نہیں ہوتا ہے، وہ نوری ہوتا ہے، وہ لطیف ہوتا ہے کثیف نہیں ہوتا ہے، جیسے قصّۂ مریم میں آیا ہے کہ بحکم خدا روح القدس نے ایک تندرست انسان کی شکل اختیار کیا۔[2] کیا آپ کو گمان گزرتا

---

[1]۔ عالم ذر: عملی تصوّف اور روحانی سائنس و روحانی سائنس کے عجائب وغرائب، ص۴۸، زبورِ عاشقین ص۶۷، ہزار حکمت، حکمت نمبر۹۵۸، روح کیا ہے؟ سوال نمبر۸۶، قرآن اور عالمِ انسانیّت حصّۂ دوم، ص۷۳، صنادیق جواہر، سوال نمبر۱۴، ۴۱۹، ۵۳۸، ۵۳۹، ۸۹۷، عالم ذر کہاں ہے: زبورِ عاشقین، ص۶۸، عالم ذر کے چند نام: صنادیق جواہر، سوال نمبر۵۴۰، عالم ذر یا ذراتی جسم: قرآنی مینار، ص۱۹۲، ظہور عالم ذر: کتاب العلاج، روحانی علاج، ص۵۱، امام مبین اور عالم ذر: زبورِ عاشقین، ص۱۷ ، انبیاء اور عالم ذر: زبورِ عاشقین، ص۶۹، جمادات اور عالم ذر: زبورِ عاشقین، ص۷۳، امام عالی مقام کی عالمگیر روح میں عالم ذر: صنادیق جواہر، سوال نمبر۵۳۹۔

[2]۔ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹: ۱۷)

ہے کہ اس وقت جبرائیلؑ میں گوشت پوست تھا؟ نہیں، وہ تو لطیف معجزانہ اور ابداعی ہستی میں تھا، اس طرح یہاں پر خداوند عالم اس شخص کو توجہ دلا رہا ہے کہ دیکھو کس طرح ہم نے ہڈیوں کو ترتیب دی ہے، اور اس پر گوشت چڑھایا ہے کہ وہ ہڈیاں نظر نہیں آتی ہیں یعنی وہ ذرّات نہیں ہیں، وہ بالکل ایک مکمل انسان کی کی طرح ایک ہستی ہے، نورانی ہستی اور ابداعی جسم، جب اس کو ان تمام واقعات کی تاویل میں سے ایک ضروری حصّہ آ گیا تو تب اس نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، سو اس کو جو حیرت تھی، جو تعجب تھا، اور جیسے سوالات تھے، وہ اکثر انہی تاویلات کی بدولت ختم ہوگئے، اور اس نے کہا کہ خداوند عالم ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس گفتگو سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تاویل کا کیا نظام ہے اور قرآن کا کیا اصول ہے، روحانیت کی باتیں کس طرح قرآن میں موجود ہیں، اور کیسے کیسے ان کے حجاب اور پردے ہیں، اس کا آپ کو اندازہ ہوا ہوگا اور بہرحال ہمیں یہ کوشش کرنی ہے کہ رفتہ رفتہ ہم قرآن کی حکمتوں کو سمجھ پائیں اور کوشش کریں تاکہ ہمیں یقینِ کامل حاصل ہوجائے کہ امام زمانؑ کے دروازے کو جو دیکھتے ہیں، اور اس کی مہربانی کی طرف جو توجہ دیتے ہیں یا اس پر جو اعتماد و بھروسہ رکھتے ہیں، انہی کیلئے قرآنی علم و حکمت کے دروازے کھل جاتے ہیں، اور دوسرے بہت سے لوگ قرآن کی حرمت کرتے ہیں لیکن قرآن میں جو کچھ ہے، اس سے وہ فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں، اور قرآن میں ایک آیت ایسی بھی ہے جس کے مفہوم کے مطابق قیامت کے دن آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم خدا کے حضور میں فریاد کریں گے کہ اس کی قوم نے قرآن کو بیکار رکھا، [1] دیکھیں کہ کسی عظیم کی پیغمبر کی قوم اس کی پوری امت ہوتی ہے، اس میں اچھے برے سب آ جاتے ہیں، جس طرح جب کہا جاتا ہے "قومِ موسیٰ" تو اس میں بنی اسرائیل بھی ہیں، اور فرعون کے لوگ بھی ہیں، مومن بھی ہیں، کافر بھی ہیں سب ہیں۔

رسول اکرمؐ یہ فریاد کیوں کریں گے؟ اور کس وجہ سے کریں گے؟ اس لئے کریں گے کہ قرآن کو انہوں نے بیکار سمجھا، مطلب کہ اس کی حکمتوں کو اس کی بھیدوں کو اور اس کے اسرار کو نہیں پایا، اور اس کے ظاہر پر اکتفا کیا، اس کے لئے مومنین میں جو باہوش ہیں یہ ان کا فرض بنتا ہے کہ وہ کوشش کریں تاکہ قیامت کے دن یہ ایک حجت ہوجائے، جو بہت بڑا فیصلہ ہے، اس میں خداوند عالم دنیا میں قرآن سے متعلق جو کچھ ہوا ہے، ان

---

[1]۔ وَقَالَ الرَّسُوۡلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا ھٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَھۡجُوۡرًا (۲۵:۳۰)

واقعات کو لوگوں کے سامنے لائے گا، اور کہے گا کہ اس قرآن کا جیسا حق تھا اس حق کو لوگوں نے ادا نہیں کیا، اس کے مقصد کو نہیں سمجھا، اور قرآن کا حق یہ ہے کہ زمانۂ شریعت میں اس کے ظاہر پر عمل کیا جائے، اور زمانۂ حقیقت میں اس کے بھیدوں کو سمجھ لیا جائے، اس کے علم کو اس کی حکمت کو اس کے راز کو اس کی تاویل کو اور اس کے عجائبات کو سمجھ لیا جائے۔

یہ ایک ایسی عبادت ہے کہ اس کے برابر کوئی عبادت نہیں، بہت ہی آپ جان فشانی سے اس کلاس کو قائم رکھتے ہیں، اور اس کی طرف لپک کے آتے ہیں، لکھتے ہیں، محنت کرتے ہیں، کیسٹوں کو بناتے ہیں،[1] سنتے ہیں، یہ بہت بڑی عبادت ہے کیونکہ دنیا میں کلام الٰہی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے، اور رسولؐ نے بس اپنے بعد میں دو چیزیں چھوڑی ہیں، ایک کتاب الٰہی ہے اور دوسرا امام ہے،[2] ان دو عظیم چیزوں سے بڑھ کر کوئی اور تیسری چیز ہوتی تو لازمی طور پر رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس کا بھی ذکر فرماتے، تیسری کوئی چیز نہیں ہے قرآن سے اور امامؑ سے بڑھ کر، اور جو چیز ہے وہ اس کے طفیل سے ہے، اور اگر اسلام ہے تو اسی قرآن سے اور امامؑ سے ہے کیونکہ اسلام کا ظہور رسولؐ کی بدولت ہوا، اور رسولؐ کا جانشین امامؑ ہے، اور قرآن اللہ تعالیٰ کا معجزہ ہے، اور دوسرا معجزہ امامؑ ہے، یہ دو معجزے دو گواہوں کی حیثیت سے ہیں، اسلام میں بہت سے واقعات کی شہادت کے لئے دو گواہوں کو طلب کیا جاتا ہے، اس طرح رسولؐ کی سچائی اور صداقت پر دو گواہ ہیں، ایک قرآن ہے اور دوسرا امام ہے۔

اور اس لئے آپ کی یہ کوشش قابل ستائش ہے کہ آپ کوشش کرتے ہیں، اور ہر عملدار، ہر کارکن، ہر ممبر اپنے طور سے اس منصوبے میں، قرآن کے پروگرام میں کوشش کرتا ہے، یہ بہت اچھی بات ہے اور ان

---

[1] ۔ یعنی lectures کو cassettes میں record کرتے ہیں۔

[2] ۔ اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ اَحَدُهُمَا اَكْبَرُ مِنَ الْاٰخَرِ: كِتَابُ اللّٰهِ حَبْلٌ مَّمْدُوْدٌ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ طَرَفٌ مِنْهُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ طَرَفٌ مِنْهُ فِیْ اَیْدِیْكُمْ فَاسْتَمْسِكُوْا بِهٖ وَ عِتْرَتِیْ۔ ترجمہ: یقیناً میں تمہارے درمیان دو عظیم الشّان اور گرانقدر چیزیں چھوڑ جانے والا ہوں، اُن میں ایک دوسری سے بڑی ہے: اللہ کی کتاب (قرآن) آسمان سے لیکر زمین تک کی تانی (پھیلائی) ہوئی رسّی ہے، جس کا ایک سرا خدا کے ہاتھ میں اور دوسرا تمہارے ہاتھوں میں، پس تم اس کو محکم پکڑے رہو اور ساتھ ہی ساتھ میری عترت کو۔ (ہزار حکمت: ۱۴۰، ۳۸۷ سوسوال: ۱۳، قرآنی سائنس حصّۂ چہارم: ۱۱۳) اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ كِتَابُ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِیْ اَهْلُ بَیْتِیْ۔ ترجمہ: میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑ جانے والا ہوں، کتاب اللہ اور عترت۔ (سلسلۂ نور امامت: ۹۲، شہد بہشت: ۱۷۷، چالیس سوال: ۲۲، گلہائے بہشت: ۷۲ سوسوال: ۱۳، قرآنی سائنس حصّۂ اوّل: ۷۸) اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ اَحَدُهُمَا اَكْبَرُ مِنَ الْاٰخَرِ: كِتَابُ اللّٰهِ حَبْلٌ مَّمْدُوْدٌ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ طَرَفٌ مِنْهُ عِنْدَ اللّٰهِ وطرفٌ مِنْهُ فِیْ اَیْدِیْكُمْ فَاسْتَمْسِكُوْا بِهٖ وَ عِتْرَتِیْ۔ ترجمہ: یقینا میں تمہارے درمیان دو عظیم الشّان اور گرانقدر چیزیں چھوڑ جانے والا ہوں، ان میں ایک دوسری سے بڑی ہے: اللہ کی کتاب (قرآن) آسمان سے لیکر زمین تک تانی (پھیلائی) ہوئی رسّی ہے، جس کا ایک سرا خدا کے پاس ہے اور دوسرا تمہارے ہاتھوں میں، پس تم اس کو محکم پکڑے رہو اور ساتھ ہی میری عترت کو۔ (ہزار حکمت: ۱۴۰، ۳۸۷)

شاء اللہ خداوند عالم آپ کی اس کوشش میں برکت پیدا کرے گا، اور بہت اچھا کام ہوگا، اور اس سے ساری جماعت کو بلکہ ساری انسانیت کو فائدہ ہوگا، اور یہ امید ہے کہ دنیامیں جوتعصب ہے وہ ختم ہوجائے گا، ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا جس میں سچائی کے لئے سب لوگ توجہ دیں گے، اور سچائی جہاں بھی ہو اس کی تلاش ہوگی، اس کی قدر دانی کی جائے گی، اس وقت آپ کا یہ کارنامہ بڑا مفید ثابت ہوسکتا ہے، اس سے پیشتر آپ دیکھتے ہیں کہ ابھی بھی جماعت کو اس سے مختلف طریقوں سے فائدہ ملتا ہے، کوئی night school میں پڑھاتا ہے، کوئی وعظ کرتا ہے، کوئی article لکھتا ہے، کوئی باہر جاکر بیرونی دنیا میں مذہب کا پرچار کرتا ہے، اور اسی طرح مختلف طریقوں سے اس قرآن کی تعلیم سے، قرآن کی تعلیمات سے بہت کچھ فائدہ ہونے کی توقع ہے، بہت کچھ فائدہ جماعت کو حاصل ہونے کی امید ہے، اور ہم یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ اس میں امامؑ کی بہت بڑی خوشنودی ہے کیونکہ آج کل امامؑ نے تعلیم کے جومنصوبے بنائے ہیں، ان میں بھی قرآن کی بہت بڑی اہمیت ہے، اور قرآن کی اہمیت ہمیشہ سے ہے، کوئی ایسا وقت نہیں آیا جس میں قرآن کی اہمیت اور افادیت کم ہو، ان باتوں کے بعد میں اپنے اس سلسلے کو ختم کرتا ہوں، اور اگر کوئی سوال ہے تو بیشک آپ پوچھ سکتے ہیں آرام سے، ہم اس کے لئے جواب دینے کی کوشش کریں گے، شکریہ مہربانی۔

انہوں نے اس میں ایک سوال پیش کیا، اس سوال کے تین حصّے ہیں، تین اجزا ہیں، اور خداوند عالم کے نُحی "زندہ کرنے والے" ہونے کا اور نُمیت "مارنے والے" ہونے کا سوال اور پھر وارث ہونے کا سوال، سوال ان کی طرف سے ایک ہے لیکن سوال کے تین اجزا ہیں۔

سب سے پہلے یہ کہ بیشک خداوندِ عالم ہی ہیں جو زندہ کرتے ہیں، اور وہی ہیں جو مارتے ہیں، اور وہی ہیں جو کائنات بھر کے روئے زمین کے تمام لوگوں کے وارث ہیں۔[1] یہ تو مختصر سا ترجمہ ہوا، اب وضاحت سے اس سوال کا جواب تفصیل سے (دی جاتی ہے) یہ کہ خداوند عالم زندگی عطا کرتا ہے، اور مختلف درجات پر حیات پائی جاتی ہے، سب سے پہلے نباتات یعنی اگنے والی چیزیں ہیں، اس کے بعد جانور ہیں پھر انسان ہیں، فرشتے ہیں، یہ مختلف حیات کے زندگی کے مختلف مراتب ہیں، ان مراتب کی زندگی ایک جیسی نہیں ہے، اوپر سے اوپر جو زندگی ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ ہے، سو خداوند عالم زندگی دینے والا ہے، زندہ کرنے والا ہے یعنی پیدا کرنے والا ہے، پھر مارنے والا بھی ہے، اس آیت کا اطلاق انسان کی اس زندگی پر ہوتا ہے، کیونکہ ہم

---

[1] ۔ وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ (۱۵:۲۳)

یہاں دیکھتے ہیں کہ پہلے انسان زندہ ہو جاتا ہے پھر مرجاتا ہے ایک بات، کیونکہ اس میں پہلے تو زندگی کا ذکر ہے اور پھر بعد میں موت کا ذکر ہے لیکن چونکہ یہ ایک گول دائرہ ہے اس واسطے کبھی موت سے تذکرہ شروع ہوسکتا ہے کبھی حیات سے بھی تذکرہ شروع ہوسکتا ہے، گول میں کوئی دو چیزیں چلتی ہیں تو ان کے آگے پیچھے ہونے کا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا ہے، کیونکہ ایک اور آیت ہے اس میں کہا گیا ہے کہ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ (۶۷: ۲) اس میں تو پہلے موت کا ذکر آیا، پھر حیات کا ذکر آیا، لہٰذا اس آیت کا پہلا تعلق یا زیادہ سے زیادہ تعلق اس دنیوی زندگی سے ہے، کیونکہ اس میں پہلے زندگی آتی ہے، پھر اس کے بعد موت۔

اور اس سوال کا تیسرا جز کہ خدا کن معنوں میں وارث ہے (۱۵: ۲۳) سب سے پہلے وارث کے مطلب کو سمجھنا چاہیے کہ وارث اس کو کہتے ہیں جو کسی مرے ہوئے (انسان) کا جانشین ہو اور اس کے چیزوں کو سنبھالے، یہاں پر جب انسان فنا ہو جاتا ہے اور اصل میں واصل ہو جاتا ہے تو ایک طرح سے ہم خدا کی ایک جائیداد کی حیثیت سے اس کے ساتھ مل جاتے ہیں، ابھی ابھی ذکر ہوا تھا کہ انسان کو جو مرکر زندہ ہو جانا ہے اس میں وہ مبدَع میں زندہ ہو جاتا ہے اور کہیں زندہ ہونے کی کوئی جگہ نہیں ہے، اس کے علاوہ اگر انسان کی کوئی دنیا رہ جاتی ہے، کوئی جائیداد، کوئی اولاد، کوئی کارنامہ، کوئی تاریخ، اس کا بھی مالک خدا ہی بن جاتا ہے، اور کیا ہی اچھا ہے کہ ہمارا وارث خدا ہوجائے، روح کا وارث، انا کا وارث، زندگی کا وارث، دنیا کا وارث اور آخرت کا وارث تو اسی طرح ہم خدا میں فنا ہوجاتے ہیں، میرے خیال کے مطابق اس سوال کا ایک طرح سے جواب مہیا کیا گیا۔

اس پر ہمارے عظیم دوست کے ساتھ گفتگو ہوئی تھی، انہوں نے اور ہم نے جو discus کیا تو اس کا result یہ تھا کہ اصل میں وہاں چونکہ monorealism ہے، لہٰذا مبدِع اور مبدَع ایک ہی ہستی ہے یعنی مبدِع کا اپنا ہی ظہور مبدَع ہے، اس میں ظہورات ہوتے رہتے ہیں، manifestations ہوتے رہتے ہیں، اس لئے وہ ایک ہی حقیقت ہے، وہاں پر چونکہ unity ہے، وہاں پر چونکہ monorealism ہے، لہٰذا بہت سی حقیقتیں وہاں ایک ہیں سو اس مقام پر اور اس درجے میں مبدِع یعنی ابداع کرنے والا اور مبدَع جو اس نے ابداع کیا، اس کا result دونوں ایک ہی ہیں، جیسے ایک سمندر ہے اور موجیں اسی میں سے اٹھتی ہیں، اور اسی میں ضم ہوجاتی ہیں تو پھر حباب ہے یا لہر ہے یا طوفان ہے، یہ سب سمندر کے کرشمے ہیں، اس لئے وہ ظہورات کا مقام ہے، اس کو کہتے ہیں كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَانٍ (۵۵: ۲۹) ہر دور میں اس کی ایک شان ہوتی

ہے، وہ ایک حقیقت ہے لیکن اس کے مظاہرے الگ الگ ہیں، جلوے الگ الگ ہیں، اس کو تجلی کہتے ہیں، اس کو جلوہ نمائی کہتے ہیں، اس کو manifestations کہتے ہیں، اس کو ظہورات کہتے ہیں، ان تمام لفظوں کا خلاصہ اور مقصد ایک ہی ہے، جب دنیا بھر کے مومنین اس مقام میں مل جائیں گے تو پھر ہر مومن کا کارنامہ اس کا ایک جلوہ یا کہ اس کا ایک ظہور قرار پائے گا، پھر تو وہاں پر نہ میں رہوں گا نہ آپ رہیں گے نہ کوئی اور، بلکہ بس ایک ہی ذات کہنے لگے گی بس یہ تو میرے ظہورات تھے، کوئی نہیں اور سب کی نفی ہوجائے گی، جیسے سمندر کہے کہ بارش کے قطرات میں ہوں، ندی میں ہوں، دریا میں ہوں، اور پانی کے جتنے اجزا اس دنیا میں ہیں میں ہوں، بادل بھی میں ہوں، برف بھی میں ہوں، چشمہ بھی میں ہوں اور طوفان بھی میں ہوں اور موج بھی میں ہوں، اور حباب بھی میں ہوں، اور یہ بات صحیح ہوگئی کیونکہ یہ سب سمندر کے چھوٹے بڑے ظہورات یا کہ manifestations ہیں پھر یہ حباب کے لئے اور یہ ندی کے لئے اچھی بات ہے کہ سمندر ایسے دعوے کرے۔

سوال: تاویل کا دور تو بہت لمبا ہوتا ہے، تو اس شخص نے ایک دن یا اس سے بھی کم کیوں کہا؟

ہاں یعنی اس پر تنزیل کا دور گزر رہا تھا لہٰذا اس کا علم جو محدود تھا، جس طرح وہ روحانیت کو بہت کم اہمیت دیتا تھا، اور ایک ہی چیز کے اندر ہزاروں چیزیں جس طرح تاویل ہی دکھاتی ہے، یہ بات اس وقت نہیں تھی، لہٰذا اس نے روحانیت کو بہت محدود سمجھا۔

سوال: گدھے کو آواز کو اللہ کیوں پسند نہیں فرماتا ہے[1] جبکہ اس کو اللہ ہی نے بنایا؟ اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟

گدھے سے یہاں کوئی مخلوق مراد ہوسکتی ہے، ظاہری طور پر یہ اس موقع کے لئے ہے، جیسے گفتگو اور لہجہ کو کس طرح رکھنا چاہیے اور کیسی گفتگو ہونی چاہیے، اس سلسلے میں کلام کا ظاہری رخ ایسا ہے لیکن باطنی طریقے سے اور تاویل کے طور پر یہ ہے کہ گدھا یہاں کسی چیز کو، کسی صلاحیت کو represent کرتا ہے، اور خدا کسی چیز کی مذمت کرتا ہے لیکن جو ابھی ہم نے اپنی اس تاویل میں گدھے کی تاویل جو ہم نے کی، جس طرح وہ انسان کا اپنا جسم تھا، اور تاویل کا جو اصول ہے وہ یہ کہ تاویلیں بدلتی رہتی ہیں، مثال کے طور پر گائے

---

[1] ۔ اِنَّ اَنۡکَرَ الۡاَصۡوَاتِ لَصَوۡتُ الۡحَمِیۡرِ (۳۱:۱۹)

کی تاویل جہاں قربانی میں پیر ناصر خسرو (قدس اللہ سرہ) نے گائے کی تاویل کی ہے،[1] وہ بہت اچھی تاویل ہے لیکن سورۂ یوسف میں جو سات موٹی گائیں ہیں اور سات دبلی گائیں ہیں[2] ان کا مختصر مفہوم نفس خورندہ ہے یعنی کھانے والا نفس کو represent کرتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی جانور میں ایک سے زیادہ خصوصیات ہوتی ہیں، اور یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ تاویل میں جو اس جانور کا نام لیا گیا ہے اس میں اس جانور کی کونسی خاصیت مراد ہے؟ یہ دیکھنا ہوتا ہے، لہٰذا کوئی بھی جانور مختلف آیات میں مختلف تاویلات کو represent کرے گا۔

کتے کی ایک مقام پر مذمت ہے قرآن میں[3] اور دوسرے مقام پر جو اصحاب کہف کا کتا ہے،[4] اس میں ایک اچھی تاویل ہے، کسی اور آیت میں اس کی بری تاویل بنتی ہے، اور اسی طرح گدھے میں کئی خصوصیات ہیں، اور ان خصوصیات کے مطابق اس کی تاویل بنتی ہے، جہاں جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا کہ گدھے کی آواز کی مذمت کی گئی ہے، یہ سورۂ لقمان ہے، جس میں لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے، نرم گفتگو کے سلسلے میں تلقین کرتا ہے، اور بہت تواضع سے چلنے کی تلقین کرتا ہے، اور سب سے پہلے خدا کے ساتھ شرک نہ کرنے اور توحید کو ماننے کی وصیت کرتا ہے، پھر اسی طرح گفتگو کے سلسلے میں اسے کہتا ہے کہ نرم لہجے میں بات کرو دیکھو کہ جانوروں میں جس کی بری آواز ہے وہ گدھا ہے،[5] اس میں روحانیت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ روحانیت میں کئی آوازیں ہیں، ان میں اچھی آوازیں ہیں، بری آوازیں ہیں وغیرہ، آج کل کے زمانے میں جو تقاریر کرتے ہیں لوگ یا جس طرح بعض مثالوں میں باتیں ہوتی ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ دلنشین آواز کونسی ہونی چاہیے، جسے انسان پسند کرے وغیرہ، اس میں بہت سی باتیں ہیں۔

انہوں نے سوال کیا تھا کہ اس مقالے کے حوالے سے (کہ) اس میں ایک شفاف شیشہ ہے اور ایک

---

[1] ۔ وجہ دین (اردو) کلام نمبر ۲۴، صفحہ نمبر ۲۴۴۔

[2] ۔ وَقَالَ الۡمَلِكُ اِنِّیۡۤ اَرٰی سَبۡعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاۡكُلُهُنَّ (۱۲:۴۳) یُوۡسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیۡقُ اَفۡتِنَا فِیۡ سَبۡعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاۡكُلُهُنَّ (۱۲:۴۶)

[3] ۔ وَلَوۡ شِئۡنَا لَرَفَعۡنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخۡلَدَ اِلَی الۡاَرۡضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ ۚ كَمَثَلِ الۡكَلۡبِ ۚ اِنۡ تَحۡمِلۡ عَلَیۡهِ یَلۡهَثۡ اَوۡ تَتۡرُكۡهُ یَلۡهَثۡ ؕ (۷:۱۷۶)

[4] ۔ وَتَحۡسَبُهُمۡ اَیۡقَاظًا وَّهُمۡ رُقُوۡدٌ ۚ وَنُقَلِّبُهُمۡ ذَاتَ الۡیَمِیۡنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۫ وَكَلۡبُهُمۡ بَاسِطٌ ذِرَاعَیۡهِ بِالۡوَصِیۡدِ ؕ لَوِ اطَّلَعۡتَ عَلَیۡهِمۡ لَوَلَّیۡتَ مِنۡهُمۡ فِرَارًا وَّلَمُلِئۡتَ مِنۡهُمۡ رُعۡبًا (۱۸:۱۸)

[5] ۔ وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا لُقۡمٰنَ الۡحِكۡمَةَ اَنِ اشۡكُرۡ لِلّٰهِ ؕ وَمَنۡ یَّشۡكُرۡ فَاِنَّمَا یَشۡكُرُ لِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ (۳۱: ۱۲) وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا لُقۡمٰنَ الۡحِكۡمَةَ اَنِ اشۡكُرۡ لِلّٰهِ ؕ وَمَنۡ یَّشۡكُرۡ فَاِنَّمَا یَشۡكُرُ لِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ (۳۱: ۱۲) یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنۡ تَكُ مِثۡقَالَ حَبَّةٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ فَتَكُنۡ فِیۡ صَخۡرَةٍ اَوۡ فِی السَّمٰوٰتِ اَوۡ فِی الۡاَرۡضِ یَاۡتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ ○ یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاۡمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَانۡهَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ○ وَلَا تُصَعِّرۡ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرٍ ○ وَاقۡصِدۡ فِیۡ مَشۡیِكَ وَاغۡضُضۡ مِنۡ صَوۡتِكَ ؕ اِنَّ اَنۡكَرَ الۡاَصۡوَاتِ لَصَوۡتُ الۡحَمِیۡرِ (۳۱: ۱۶ تا ۱۹)

آئینہ ہے، آئینہ انسان کامل ہے، اور شفاف شیشہ فرشتہ ہے، اور انہوں نے شاید کچھ اس طرح سوال کیا تھا کہ مومنوں سے کیوں فرمایا جاتا ہے کہ فرشتہ بنو، اگر انسان فرشتہ سے آگے ہے تو پھر فرشتہ بننے کی نصیحت یا ارشاد یا ہدایت کیوں ہوتی ہے؟ میں نے ان سے عرض کیا کہ عوام ابھی سادہ شیشہ بھی نہیں بنے ہیں آئینہ بننا تو درکنار، جو کامل انسان ہے وہ آئینہ ہے، جو فرشتے ہیں وہ شفاف شیشے ہیں، جو عوام ہیں وہ تو ابھی فرشتے سے نیچے ہیں، ان کو پہلے شفاف شیشہ بننا چاہیے، پھر شفاف شیشے سے آئینہ بنایا جاتا ہے، شفاف شیشے اور آئینے میں یہ فرق ہے کہ شفاف شیشے سے نہ تو روشنی reflected ہوجاتی ہے اور نہ اس میں انسان کی شکل نظر آتی ہے تو روشنی بھی پار گزرتی ہے اور سورج بھی اور نظر بھی تو وہ نہ تو آئینہ ہے اور نہ اس میں کوئی عکس بنتا ہے، اسی طرح انسان کامل شیشہ بھی ہے اور آئینہ بھی ہے، اور جو انسان ناقص ہے، وہ نہ تو آئینہ ہے اور نہ شفاف شیشہ ہے، اب تو تین چیزیں ہوگئیں نا؟ ایک انسان کامل ہے جو فرشتہ سے بڑھ کر ہے، ایک فرشتہ ہے جو انسان کامل سے نیچے ہے، ایک عوام الناس ہیں جو کوشش کریں تو فرشتہ ہوسکتے ہیں، اور جو کوشش نہیں کریں تو گر بھی سکتے ہیں کیونکہ ایک عام انسان کو جو مقام ملا ہے، وہ فرشتہ اور حیوان کے درمیان ملا ہے، اس عام انسان کے نیچے حیوان ہیں اور اس کے اوپر فرشتہ ہے، اگر گر گیا تو حیوان میں گر گیا، اور اگر اوپر چڑھا تو فرشتہ بن گیا، اور اس سے بھی اوپر گیا تو وہ انسان کامل ہوگیا۔

قصّۂ آدم میں اس کا پتہ چلتا ہے کہ صاف شیشہ کون تھے، اور آئینہ کون تھے، اس article میں یہ لکھا گیا ہے کہ آدم کو پہلے شفاف آئینہ بنایا گیا تھا پھر اس شیشے سے اس کو آئینہ بنایا گیا، پہلے آدم کو شفاف شیشہ بنایا گیا تھا، پھر اس شیشے سے اس کو آئینہ بنایا گیا، اور یہ بھی کہا گیا کہ فرشتہ ایک پہلو سے فائدہ اٹھاتا ہے اور انسان دو پہلوؤں سے فائدہ اٹھاتا ہے، فرشتہ صرف خیر سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور جو کامل انسان ہے وہ خیر و شر دونوں سے فائدہ اٹھاتا ہے، دوسرا آسان لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ فرشتہ عقل سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور جو ہوشمند انسان ہے وہ عقل سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے اور نفس کے خلاف چل کر اس کے ساتھ جہاد کر کے اس سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے لیکن فرشتے کے سامنے جہاد کرنے کے لئے کوئی چیز نہیں ہے، دیکھیں کہ دنیا میں بہادر کی بڑی عزت ہے، اور بہادر شخص کو سب لوگ پسند کرتے ہیں لیکن فرشتے کے سامنے بہادری کے لئے کوئی میدان نہیں ہے، کوئی دشمن بھی نہیں ہے لیکن انسان کے سامنے خداوند عالم نے بہادری دکھانے کے لئے، بہادری کے جوہر دکھانے کے لئے ایک دشمن کو رکھا ہے، اور وہ نفس ہے اور شیطان ہے تو یہ شر سے فائدہ اٹھانا

ہوا، اور فرشتے سے کوئی امتحان نہیں ہے پھر کوئی اس سے حساب کتاب بھی نہیں ہے، پھر اسی کے ساتھ کوئی اس کو فضیلت بھی نہیں ہے۔ (یہاں پر لیکچر ختم ہوجاتا ہے)

ٹائپ ونظر ثانی: احمد ندیم سمویو

Click here
for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی ؒ کا پُرحکمت بیان
عنوان: کتاب ثبوتِ امامت میں دیئے گئے دلائل کی وضاحت
کیسٹ نمبر: Q-42 تاریخ: ۱۱ر دسمبر ر ۱۹۸۳ کراچی

عزیزانِ من! یا علی مدد۔

آپ نے محترمہ شاہدہ کو سنا، اُنہوں نے اُصولِ افضلیت پر بہت ہی شاندار طریقے سے تقریر کی اور تفصیلاً آپ کو بتایا کہ اُصولِ افضلیت کیا ہے۔ بے شک خدا کی خدائی میں، اُس کی اِس کائناتِ ظاہر میں نیز عالم باطن میں اور ہر مقام پر اُصولِ افضلیت کارفرما ہے۔ اُصولِ افضلیت کا مطلب جیسا کہ آپ نے سن لیا کہ چیزیں گروپوں میں پائی جاتی ہیں اور ہر گروپ میں ایک چیز سردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ بڑی چیزوں کو لیں یا چھوٹی چیزوں کو لیں جہاں بھی جائیں گے، جس مقام کو بھی دیکھیں گے، اُس مقام پر یہی قانون ہے کہ تمام چیزیں یکساں نہیں ہیں بلکہ ہر چیز افضل و اعلیٰ ہے۔ یہ اِس لئے کہ دین میں پیغمبر اور امام تمام لوگوں پر خدا کی جانب سے بادشاہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور اِسی قانون میں سب انسانوں کا فائدہ ہے۔ آپ نے اِس سلسلۂ گفتگو میں یہ بات بھی سن لی کہ دنیا کی بادشاہتوں سے بھی مثال لی گئی، تنظیموں سے بھی مثال لی گئی حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ حقیقت میں بادشاہت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ بادشاہِ حقیقی پیغمبر اور امام ہیں، اُن کے ہوتے ہوئے کسی بادشاہ کا کوئی حق نہیں ہے، لیکن ایک بات یوں ہے جیسا کہ قرآن میں ہے کہ دنیا میں کئی چیزیں باطل ہیں، غلط ہیں لیکن خدا کی حکمت دیکھئے کہ اِن غلط چیزوں میں بھی اشارے ہیں۔ کیا ہیں وہ اشارے؟ یہ کہ وہ حق اور حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ خدا کا جو نور ہے وہ اعلیٰ و افضل ہے اور وہ دائم و قائم ہے۔

میرے کہنے کا مقصد یوں ہے کہ اگر کوئی چیز دنیا میں ناپائیدار ہے، فانی ہے اور زوال پذیر ہے، تو وہ چیز اپنے اِس زوال سے یہ اشارہ کرتی ہے کہ ایک ایسی چیز ہے جو غیر فانی ہے، جو لازوال ہے جو پائندہ ہے۔ جس طرح تاریکی میں روشنی کا تقاضا ہوتا ہے اور جس طرح غریبی میں تونگری کا اشارہ پایا جاتا ہے، اور جیسے رسولؐ کا ارشاد ہے کہ: ''تُعْرَفُ الْاَشْيَاءُ بِاَضْدَادِهَا'' چیزیں اُن کی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں۔ چنانچہ دنیا میں جو باطل سردار ہیں وہ باطل ہیں، وہ حق پر نہیں، وہ حق بجانب نہیں۔ لیکن اُن کے اِس بطلان میں بھی حق و حقیقت کے استحقاق کا اشارہ پایا جاتا ہے، اور اِسی معنی میں فرمایا گیا قرآن میں کہ خداوندِ عالم حق کو اُٹھا کر باطل پر دے مارتا ہے (۱۸:۲۱) اور اِس سے باطل کا بھیجا نکلتا ہے، سو وہ باطل اِسی

کے ساتھ چلا جاتا ہے، دیکھا کہ کیسی مثال ہے جو حکمت سے بھرپور ہے، خدا حق کو پتھر بناتا ہے اور باطل کو ایسی چیز بناتا ہے جس کے اندر بھیجا ہے یا مغز ہے، تو سچائی کے پتھر سے باطل کو مارتا ہے اور اِس کے نتیجے میں باطل کا بھیجا نکلتا ہے اور وہ باطل خود چلا جاتا ہے۔ مطلب اِس کا یہ ہوا کہ باطل کے اندر بھی ایک راز ہے، گو کہ باطل کا وجود مٹ جاتا ہے لیکن وہ راز ظاہر ہو جاتا ہے اور وہ رازِ حق کا (favor) کرتا ہے۔ اِسی طرح اِس اُصولِ افضلیت میں جو آپ سے کہا گیا کہ دنیا میں بادشاہتیں ہیں یا تنظیمیں ہیں یا کسی قبیلے کا کوئی سردار ہے، تو یہ بھی ایک دلیل ہے کہ امام کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ سو یہ اُصولِ افضلیت ایک بہت ہی روشن حقیقت ہے، کہ تمام چیزوں کی قسموں میں، اور الگ الگ گروپوں میں ایک چیز افضل ہے۔ جیسے آپ کو ابھی بتایا گیا کہ آسمان ہے تو خواہ وہ آسمان کیسے بھی ہیں تو اُن سے بحث نہیں ہے لیکن آسمان ہیں، سات ہیں یا نو ہیں لیکن جو سب سے باہر کا آسمان ہے وہ دیگر آسمانوں پر محیط ہے، وہ غلاف کے طور پر ہے کہ اُس نے دوسرے آسمانوں کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ جس طرح سورج کی مثال دی گئی کہ وہ ایک ایسا روشن ستارہ ہے جو ساکن ہے اور دیگر ستارے اُس کے گرد طواف کرتے ہیں، جس طرح شمع کے گرد پروانے طواف کرتے ہیں، اِسی طرح سورج ساکن ہے اور سائنس بھی کہتی ہے کہ سورج ساکن ہے، لیکن اِس سکون میں بھی ایک طرح کی حرکت ہے اور اِسی طرح امام ہی وہ نور ہے جس سے پوری ہستی کو یا پوری موجودات کو روشنی ملتی ہے اور پھر امامؑ میں ایک نرالی شان والی حرکت ہے، جس طرح سورج ایک طرح سے ساکن ہے لیکن اُس کے سکون میں ایک طرح کی حرکت ہے اور اُس حرکت میں پوری کائنات کے لئے رحمت ہے اور اِنہوں نے بتایا کہ انبیاء علیہم السّلام ہیں، اُن میں بھی اُصولِ افضلیت کارفرما ہے، کہ اُن میں ایک سردار رسول ہیں اور پھر انسان ہے اور انسان کے جسم میں مختلف اعضاء ہیں اور اِن اعضاء میں بھی ایک عضو خواہ وہ دماغ ہو یا دل، افضل ہے، تو پھر دنیا کی جیسے اِنہوں نے بتایا کہ آسمان اور ستاروں کے بعد مواالیدِ ثلاثہ، تین بچے، تین بچوں سے مراد جمادات، نباتات اور حیوانات، تو اِن تینوں میں جمادات سے بڑھ کر نباتات ہیں اور نباتات سے بڑھ کر حیوانات ہیں اور اگر آپ اِن میں سے ہر ایک کو لیتے ہیں تو ہر ایک میں بھی یہی بات ہے کہ جمادات جو بے جان چیزیں ہیں، آپ دیکھتے ہیں کہ اُس میں جواہرات ہیں اور جواہرات میں بھی مقابلہ ہے۔ نباتات کو لیجئے کہ درخت ایک جیسے نہیں ہیں، جڑی بوٹیاں ایک جیسی نہیں ہیں، پھول ایک جیسے نہیں ہیں، تو اُن کا انتخاب کریں تو آخر میں ایک چیز آپ کے سامنے آتی ہے۔

اِسی طرح پھر جانوروں کو دیکھئے، جانوروں کے انتخاب میں آپ کسی بھی لحاظ کو رکھیں، جسامت کے لحاظ سے دیکھیں، ہوشمندی یا انسان کے نزدیک ہونے کے اعتبار سے دیکھیں، اور تھوڑی سی عقل کی جو جھلک ہے اُس کے اعتبار سے دیکھیں یا انسان کو جو فائدہ ملتا ہے اُس اعتبار سے دیکھیں تو ہر اعتبار سے ایک جانور دیگر جانوروں پر افضل قرار پائے گا۔ پھر انسانوں کو لیجئے انسانوں کے طبقات ہیں اور ہر طبقے میں بھی یہی بات ہوگی کہ کوئی فرد افضل قرار پائے گا اور آخر میں گروہِ

انبیاء اور ائمہؑ افضل قرار پائیں گے اور پھر اُس گروہ میں بھی ایک فرد سب سے افضل و اعلیٰ قرار پائے گا۔

یہ ساری باتیں کیوں ہیں؟ اِس لئے ہیں کہ کوئی سوچنے والا سوچے، جیسے خداوندِ عالم قرآنِ مقدّس میں بار بار تاکید فرماتا ہے کہ سوچو، اِس جہانِ ظاہر میں سوچو، کتابِ سماوی میں سوچو اور اپنی ذات میں سوچو، کیونکہ جو قانون اِس عالمِ ظاہر میں کارفرما ہے، وہی قانون کتابِ سماوی میں بھی ہے اور پھر انسان کی ذات میں بھی ہے۔ اِن تین جگہوں میں کوئی اختلاف نہیں اور آیات جو ہیں یعنی نشانیاں اِن تین جگہوں میں پائی جاتی ہیں کائنات، کتابِ خدا اور انسان کی ذات، تو اِن تمام آیات میں ایک ہی قانون ہے، اور آپ قرآن کی آیات کا انتخاب کریں تو اُس میں بھی یہی بات ہوگی اور میں عرض کرسکتا ہوں کہ اگر آپ قرآن کی آیات کا انتخاب کریں اور یہ تجربہ کریں یا یہ دیکھیں کہ آیا سب آیات یکسان ہیں یا اُن میں کوئی گروپ افضل و اعلیٰ ہے، تو آپ کو آیاتِ نور سب سے اعلیٰ و افضل ملیں گے، کیوں؟ دوسری آیات بھی تو آیات ہی ہیں، ہاں! دوسری آیات بھی تو آیات ہی ہیں لیکن آیاتِ نور کی اہمیت اِس لئے بہت بڑی ہے کہ اُن سے دیگر آیات پر روشنی پڑتی ہے، اُن کی بدولت قرآن کی شناخت ہو جاتی ہے، اُن کی وجہ سے قرآن سمجھ میں آتا ہے اور پھر اُن آیاتِ نور کے آپس میں دیکھیں تو ایک آیت نکھر کر آپ کے سامنے آئے گی، وہ: ”اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ“ (۳۵:۲۴)۔ یہ آیت سب سے افضل و اعلیٰ کیوں ہے؟ اِس لئے کہ اِس میں خدا کے تصور کی وضاحت ہو جاتی ہے اور ایک جاننے والے کے لئے اِس میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے کہ خدا کی حقیقت کیا ہے اور اِس میں خدا کا نور، رسول کا نور اور امام کا نور ایک ہی قرار پاتا ہے اور اِس سے بڑھ کر ایک مومن کے لئے کیا، تو پھر یہاں پر خدا کی وحدانیت کا پتہ چلتا ہے اور سارے مسائل ختم ہو جاتے ہیں، اِس لئے، اور یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات علیہ اپنی کتاب ”آپ بیتی“ میں اِس آیت کی اہمیت ظاہر کرتے ہیں [اسلام میرے مورثوں کا مذہب صفحہ نمبر ۹) اور جو ایسے عظیم امام کسی آیت کی اہمیت بتائیں گے تو وہ بات بالکل ہی صحیح ہوگی اور اُس آیت کی بہت بڑی اہمیت ہوگئی اور مومن کو اُس کی طرف توجہ دینی پڑے گی۔ یہ ہے اُصولِ افضلیت اور مومن کو اِس کی طرف توجہ دینی چاہیے اور مومن اِن ہی خطوط پر سوچ سکتا ہے اور اِسی خاکے کے مطابق وہ امام کے بارے میں اپنے دلائل کو تیار کرسکتا ہے، سمجھ سکتا ہے، تو یہ ہے اُصولِ افضلیت اور اگر اِس کے بارے میں کوئی سوال ہو تو آپ پوچھ سکتے ہیں۔ مہربانی، شکریہ۔

اِس مقام پر ایک بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ ہم بعض دفعہ ایک اور موضوع کو یا ایک اور تصور کو آپ کے سامنے رکھتے ہیں وہ مونوریالزم کا تصور ہے۔ جو اگر فوری طور پر دیکھا جائے اور بلاسوچے دیکھا جائے تو اِس میں اور اُس میں تضاد ہو سکتا ہے یعنی اُصولِ افضلیت اور مونوریالزم میں، لیکن یہ بات صرف ظاہری اور سطحی اعتبار سے ہے، مگر حقیقت میں سوچا جائے تو اِس میں اور اُس میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ آپ باور کرسکتے ہیں کہ اُصولِ افضلیت کیوں ہے؟ یہ مومنین کے فائدے کی

خاطر ہے بلکہ ساری انسانیت کے فائدے کی خاطر ہے کہ دنیا میں کوئی خدائی سردار ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر کچھ لوگ کسی ملک سے کہیں سفر پر جاتے ہیں یا کسی اور کام کے پیچھے جاتے ہیں اور سب تقریباً تقریباً برابر اور ایک جیسے ہیں تو لازمی طور پر اُنہیں اپنے اختیار سے ایک سردار کو بنانا پڑے گا کسی بھی نام سے۔ اگر وہ دانش مند ہیں، اگر وہ اتفاق کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، اپنی بھلائی چاہتے ہیں، فائدہ چاہتے ہیں، حفاظت چاہتے ہیں تو یہ لازمی ہے کہ وہ اپنے اوپر خود اپنے اختیار سے ایک سردار بنائیں گے اور اِس مطلب کی مثال آج کی جمہوریتیں ہیں کہ ہر جمہوریت میں عوام اپنی مرضی سے اپنی خوشی سے کسی اور کو اپنے اوپر مسلّط کرتی ہے کیونکہ اِس میں اُس کا فائدہ ہے۔ چنانچہ اگر دنیا میں خداوندِ عالم نے پیغمبروں کو اور اماموں کو انسانوں کے اُوپر بادشاہ اور سردار بنایا ہے تو اِس میں سب انسانوں کا فائدہ ہے، ایسا نہیں کہ اِس میں صرف پیغمبروں کی غرض ہے یا اماموں کی عزّت مقصود ہے، یہ بات نہیں ہے، اِس میں انسانیت کا مفاد ہے۔ پس جب یہ فائدہ حاصل ہوگا تو ایک ایسا عالم سامنے آئے گا جس میں کہ مساواتِ رحمانی ہے، جہاں برابری ہے، جس طرح باور کیا جاسکتا ہے کہ شروع میں تمام رُوحیں مل کر ایک ہی رُوح کی حیثیت سے تھیں یا یہ کہ یہ سب رُوحیں ایک ہی عظیم رُوح کے اجزاء کے طور پر تھیں اور اِس رُوح کے یہ اجزاء دنیا میں بکھر گئے۔ کسی وجہ سے یا بلا وجہ اِن تمام رُوحوں نے ایک ایک شکل اختیار کی، مختلف۔ کیونکہ اِس دنیا کے کارخانے کو چلانے کے لئے مختلف صورتوں میں آنا لازمی تھا، یہ تو مصلحت کی بات ہوگئی ایک لحاظ سے کہ دنیا میں انسان پھیل گئے، الگ الگ ہو گئے۔ ایک مشینری کو دیکھئے سب پُرزے، راڈز، رِنگز اور واشرز اور یہ وہ سب چیزیں ایک جیسی نہیں ہوتی ہیں اور ساری چیزیں ایک جیسی ہوگئی تو مشین نہیں چلے گی۔

آپ ساری انسانیت کو یا مختلف انسانوں کو ایک بہت ہی عظیم مشینری سے تشبیہہ دے سکتے ہیں، جس طرح مشینری کے کل پرزوں کے مختلف ہونے میں حکمت و مصلحت ہے، اِس طرح انسانوں کے بہت مختلف ہونے میں مصلحت و حکمت ہے، تو جب اِس مصلحت و حکمت کا مقصد پورا ہو جائے گا تو عالمِ وحدت میں (world of unity) میں لازمی طور پر سب رُوحیں ایک ہو جائیں گی۔ لیکن وہ سب رُوحیں درجات سے، سیڑھیوں سے، زِینوں سے گزر جانے کے بعد ایک ہو جائیں گی۔ جیسے ہم نے ابھی اِس قریب میں کہا تھا کہ درجات کی مثال سیڑھی ہے اور مساوات کی مثال محل ہے، ایک بلند ترین محل میں جا پہنچنے کے لئے سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں، زینوں سے چڑھنا پڑتا ہے اور یہ قرآن ہی کی بات ہے کہ خدا نے خود کو ''ذِی الْمَعَارِجِ'' (۷۰:۳) کہا سیڑھیوں والا یعنی درجات کا مالک اور فرمایا کہ اِن سیڑھیوں سے ملائک و ارواح بہت لمبے عرصے میں چڑھتی ہیں یعنی یہ سارے درجات پیچھے چھوڑتے ہیں۔ پھر اُس کے بعد عرش کہئے یا کہ عالم وحدت کہئے یا کہ کہئے مساوات رحمانی، اُس مقام پر سب رُوحیں نفس واحدہ میں ایک ہو جاتی ہیں اور وہاں پر مونو ریالزم کی حقیقت یا کہ (unity) وحدت بن جاتی ہے، تو یہ ہے اِن دونوں تصوروں کے درمیان جو بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے تو اِس

میں کوئی تضاد نہیں بلکہ دونوں تصور اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔

یہ اُصولِ افضلیت اِس عالمِ ظاہر میں صحیح ہے اور مونو ریالزم جو ہے عالمِ وحدت میں صحیح ہے، تو یہ ہے۔ قرآن میں کئی ایسی باتیں ملتی ہیں، جن کے ظاہر سے یوں لگتا ہے کہ شاید دو آیتوں کے درمیان یا دو احکام کے درمیان تضاد ہے، کوئی تضاد نہیں ہے، اُن میں ہم آہنگی ہے اور (unity) ہے، مگر فرق یہ ہے کہ اُن دونوں آیتوں کے مقام الگ الگ ہیں، تو اِس لئے جیسے اِس عالمِ ظاہر میں سردی اور گرمی دونوں متضاد ہیں لیکن دونوں کا وجود ہے، دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اِن دونوں کے وجود کو قائم رکھنے کے لئے الگ الگ جگہیں چاہئیں۔ مثلاً گرم پانی اور ٹھنڈا پانی، آپ ایک برتن میں جمع نہیں کر سکتے ہیں اور اگر آپ نے جمع کیا تو جو گرم پانی تھا وہ اور جو ٹھنڈا پانی تھا وہ دونوں اپنے اپنے (temperature) کو کھو بیٹھیں گے اور ایک متوازن (temperature) اُن میں پیدا ہو جائے گا۔ اِس لئے کہ وہ دونوں آپس میں مل گئے تو کچھ گرمی گرم پانی سے کم ہو گئی، اور کچھ ٹھنڈک ٹھنڈے پانی سے کم ہو گئی اور دونوں ایک متوازن کیفیت میں جمع ہو گئے۔ اِس کے برعکس اگر برف یا یخ کو قائم رکھنا ہے اور پھر گرم پانی کو بھی اِس کی کیفیت کے ساتھ قائم رکھنا ہے تو اِن کو الگ الگ، دور رکھیں، گرم پانی کو الگ رکھیں اور یخ کو الگ رکھیں تا کہ اِس تضاد کے باوجود الگ ہونے کے وجہ سے یہ دونوں چیزیں قائم رہ سکیں گی۔ اِس طرح آپ تاریکی کو اور روشنی کو ایک ساتھ نہیں رکھ سکتے ہیں، جو تاریکی آ گئی تو ہو سکتا ہے کہ روشنی چلی جائے اور اگر روشنی کا غلبہ ہوا تو تاریکی جو ہے وہ معدوم ہو جائے گی، اگر اِن دونوں کو قائم رکھنا ہے تو آپ اِن دونوں چیزوں کو الگ الگ رکھیں۔ اِس لئے خداوندِ عالم نے اِس عظیم کائنات کو بنایا اور اِس میں ہر چیز کو الگ الگ جگہ دی کہ جس سے ہر چیز کا وجود قائم ہے اور اِسی طرح بہت سارے انسانوں کو خدا نے پیدا کیا اور اِن انسانوں میں الگ الگ رُوحوں کو رکھا اور جب وہ چاہے گا کہ اِن تمام ارواح کو ایک کرے تو ذرّاتِ ارواح کو ایک شخص کے اندر سمو دے گا اور پھر اُس مقام پر نفسِ واحدہ اِن تمام ارواح کو اپنے ساتھ ایک کر لے گا، تو یہ ہے اسماعیلی دین کا فلسفہ اور اُس کی حکمت، اُس کے رموز، اُس کے اشارے، اُس کا بہت گہرا علم۔

اسماعیلی مذہب میں جو علم ہے وہ بہت ہی گہرا ہے اور خدا کی خدائی کا علم اور مومن کے مرتبے کا علم، امام کی امامت کا علم اور آسمانی کتابوں کا علم، اسماعیلی مذہب میں ہیں اور سارے علوم، خدا کے سارے بھید اسماعیلی مذہب میں ہیں۔ اِس کے لئے جو مومن کوشان رہے اور اِس کی طرف توجہ دے، عاجزی کو اختیار کرے، ہر وقت عبادت و بندگی اور رات کو ریاضت کرے، بیدار رہے، جاگے رہے اور جو حیوانیت ہے اُس سے الگ ہو جائے اور نافرمانی کو چھوڑے تو پھر یہ سارے علوم جو امامؑ کے حضور میں ہیں، اُس کو رفتہ رفتہ حاصل ہو سکتے ہیں، تو کتنی بڑی بات ہے کہ آج حق اور حقیقت کو چاہنے کے باوجود لوگ حاصل نہیں کر سکتے ہیں لیکن یہ جو حق ہے وہ مولا علیؑ کے پیچھے رواں دواں ہے اور جہاں یہ حق اور

حقیقت مولاعلیؑ یعنی امامِ زمانؑ کے پیچھے روان دوان ہیں، وہاں امامؑ کے مریدوں کے پیچھے بھی ہے،تو جیسے حدیث میں ہے کہ جنّت علی کی مشتاق ہے اور اگر جنّت علی کی مشتاق ہے تو علی کے مریدوں کے لئے بھی مشتاق ہے[إن الجنة لتشتاق إلى ثلاثة: علي، وعمار، وسلمان" حدیث نمبر ۳۷۹۷،سنن ترمذی]۔جنّت کو آباد کرنے کے لئے لوگ چاہئیں، لوگوں کی ضرورت ہے،کوئی بادشاہی اور کوئی ملک،کوئی بستی،کوئی گاؤں،کوئی گھرلوگوں کے بغیر کیسے آباد ہوسکتا ہے،تو جنّت کی رونق اِس بات سے ہے کہ وہاں پرمومنین ہوں۔باتیں بہت زیادہ ہیں اور وقت بہت ہی کم ہے۔میرے خیال میں یہ چند باتیں آج کی کلاس میں کافی ہیں اور اِن شاء اللہ بفضلِ مولا آپ بہت ہی ہوشمند ہیں،مشتاق ہیں اِن باتوں کے لئے چونکہ یہ آپ کے امامؑ کی باتیں ہیں، آپ کے پاک مذہب کی باتیں ہیں،اِس لئے اُمید ہے کہ آپ ہمیشہ اِن باتوں کی طرف توجہ دیتے رہیں گے،اِن کی قدردانی کریں گے اور قدردانی یہ کہ آپ اِن کو سنتے رہیں گے اور اپنے ذہن میں بٹھا لیں گے، پھر دوسرے اچھے اسماعیلیوں کو بھی سناتے رہیں گے۔یہ سب اسماعیلیوں کی ہماری سب کی خوش بختی ہے کہ آج اتنی ساری مخلوقات میں سے ہم کو یہ ست پنتھ ملا ہے اور ہم اِس ست پنتھ پر چل رہیں ہیں اور ہمیں شکرگزار رہنا چاہیے۔شکریہ، مہربانی، یاعلی مدد۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ:سلیمہ ہونزائی　　نظرِ ثانی:اکبر علی　　پروف:نسرین اکبر

علّامہ نصیر الدّین نصیر ہونزائی (ایس۔آئی) کا پر حکمت بیان

سورۂ یاسین کا خلاصہ

Click here for Audio

پاک ہے وہ ذات جس نے تمام چیزوں کو جوڑے میں پیدا کیا

لیکچر تاریخ: ۲۲ دسمبر ۱۹۸۳ء ۔ کیسٹ نمبر: ۴۳

۔۔۔ پڑھتے ہیں جو سورۂ یاسین کی ہے، سُبۡحَانَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَمِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَمِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ (۳۶:۳۶) پاک ہے وہ ذات جس نے تمام چیزوں کو جوڑوں میں پیدا کیا، نباتات سے بھی، ان کی جانوں میں سے بھی، اور ان چیزوں سے بھی جو وہ نہیں جانتے ہیں۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا جو کچھ بھی ہے اس کا جوڑا ہے یعنی ہر چیز جفت میں پیدا ہوئی ہے، اور جفت یا کہ جوڑے کئی طرح سے ہیں، سب سے پہلے اس آیت میں اگنے والی چیزوں کا ذکر ہے، آج سائنس نے بھی ثابت کیا ہے کہ نباتات یعنی اگنے والی چیزیں جفت جفت ہوتی ہیں، اور اب سے ہزار برس پہلے ہمارے بزرگانِ دین نے یہ ثابت کیا تھا کہ جو دانہ زمین میں بویا جاتا ہے اس کی دو سوئیاں نکلتی ہیں یا دو پتیاں پیدا ہوجاتی ہیں اس لئے کہ دانہ دو حصّوں میں ہوتا ہے، ایک کو نر کا درجہ (حاصل) ہے اور دوسرے حصّے کو مادہ کا، اسی طرح پھر جانور ہیں جن کی جوڑیاں ہیں، انسان ہیں، جوڑیوں کا مطلب صرف یہی نہیں بلکہ جو متضاد چیزیں ہیں وہ بھی آپس میں جفت ہیں، مثال کے طور پر شب و روز، بلندی و پستی، امیری اور غریبی، آسمان زمین، دنیا آخرت وغیرہ، یہ سب چیزیں جو آپس میں ضد ہیں وہ جوڑے ہیں، اس آیت (۳۶:۳۶) کی یہ تشریح ہے کہ ایک ذات کسی چیز کے ساتھ ضد ہونے سے یا کسی کے ہمسر ہونے سے پاک ہے اور باقی سب چیزیں دو دو میں ہیں۔

جب ہم قرآنی حکمتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں ہمیں یقین آتا ہے کہ توحید کے بعد دوئی ہے جسے انگریزی میں duality کہتے ہیں اور جسے عربی میں تثنیہ کہتے ہیں، figures یا ہندسوں میں بھی آپ یہ دیکھتے ہیں کہ جب ایک سے گنتی شروع ہوجاتی ہے تو دو کی نوبت آتی ہے، اور دو سے آگے جو شمار ہے وہ پھیل جاتا ہے، جیسے ایک خدا کو represent کرتا ہے، اور مثال کے طور پر دو آدم کو، اور جس طرح آدم و حوا سے اتنے سارے انسان پھیل گئے، اسی طرح دو کے عدد سے تمام اعداد کا وجود بن جاتا ہے، اگر کروڑ کے حساب کو یا لاکھ یا ہزار کو close کیا جائے یعنی کم سے کم کیا جائے تو پھر یہ آخر میں سارے اعداد دو میں سما جائیں

گے، یہ بات ایسی ہے جیسے ہم انسانوں کی پیدائش اور ان کے پھیل جانے کی تاریخ کا واپس مطالعہ کرتے ہیں تو پھر اس مطالعے میں انسان کم سے کم ہوتے ہوئے آدم وحوا میں سمو جائیں گے، اس مثال سے دو کے عدد کی اہمیت روشن ہوجاتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ قرآن نے کیوں بار بار دو کی طرف اشارہ کیا ہے، پس یہ ایک دلیل ہے کہ ہماری خودی یا کہ انا بھی دو میں ہے، اور ان دونوں اناؤں نے دونوں جہاں کی نمائندگی کو لیا ہے کہ ایک ہماری انا عالم بالا میں ہے جو مستقل ہے، اور دوسری انا اس دنیامیں آئی ہے جو عارضی ہے، انہی اضداد یا کہ opposites کے سلسلے میں ہستی اور نیستی کا ذکر بھی ضروری ہوتا ہے، ہستی سب کے سامنے ظاہر ہے جسے existence وغیرہ کہتے ہیں۔

اور نیستی کے بارے میں ذرا وضاحت کی ضرورت ہے کیونکہ بعض لوگوں نے نیستی کے بارے میں کچھ اور سوچا ہے یعنی انہوں نے خیال کیا ہے کہ نیستی عدم محض ہے، "ع، د، م، زیر، م، حائے حطی[1]، ض" یہ عدم محض اس نیستی کا نام ہے جس میں کہ قطعا کچھ بھی نہیں ہے لیکن اس کے برعکس ہمارے بزرگانِ دین نے نیستی سے عالم امر مراد لیا ہے، عالم امر کا مطلب ہے کہ ہر چیز موجود ہے لیکن مجرد ہے جسم کے بغیر ہے اور اس کا ظہور صرف کن کے ساتھ ہو جاتا ہے یعنی خداوند عالم کے کن فرمانے سے لطیف وجود سامنے آتا ہے تو ایسی کیفیت کا نام نیستی ہے چونکہ یہ بنیادی تصوّر ہے، اور اس میں یہ جو فرق بتایا گیا کہ کچھ لوگ اس کو قطعی نیستی سمجھتے ہیں اور ہمارے بزرگانِ دین نے اس کو قطعی نیستی نہیں مانا بلکہ اس سے عالم امر مراد لیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسی کے ساتھ ساتھ بنیادی فرق پیدا ہوگیا، وہ بنیادی فرق بہت دور رس معنی رکھتا ہے، مثال کے طور پر نیستی سے ہستی میں آنے کے معنی اُن کے نزدیک کچھ اور ہے اور ہمارے نزدیک کچھ اور ہے، ان کے نزدیک یہ کہ خدا نے ایک بادشاہی کا آغاز کیا، جیسے ہی چیزوں کو قطعی نیستی سے ہستی میں لایا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی، اس کے برعکس ہمارے یہاں یہ ہے کہ سب چیزیں موجود تھیں مگر لطیف صورت میں عالم امر میں جسم کے بغیر ہر چیز کا وجود تھا، اور خدا نے اپنے ارادے سے کن فرمانے کے ساتھ ساتھ چیزوں کو ظہور میں لایا، یہ ہمیشہ یاد رکھیے گا کہ ہمارے یہاں نیستی سے عالم امر مراد ہے، پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی خدائی بغیر آغاز کے اور بغیر انجام کے ہے، اور دوسری بات یہ ہے، خدا کے کن فرمانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس نے ایک خاص وقت میں کن فرما کر کلی طور پر چیزوں کو وجود میں لایا ہو بلکہ وہ ہمیشہ کن فرماتا ہے[2] اور

---

[1] اس "ح" کو حائے حطی اور "ہ" ہائے ہوّز کہتے ہیں۔

[2] اسلام میرے مورثوں کا مذہب (اردو) صفحہ نمبر ۱۶، شائع کردہ اسماعیلی ایسوسی ایشن برائے پاکستان۔

اس امر کے ساتھ چیزیں ظہور پذیر ہوجاتی ہیں چونکہ اسلام دین فطرت ہے اور اس کا مطلب یہ کہ اسلام کا جو قانون ہے وہ law of nature سے ہم آہنگ ہے یا یوں کہ خود law of nature اس دین فطرت کا قانون ہے، مثال کے طور پر آپ دیکھتے ہیں کہ انسان پیدا ہوتے ہیں لیکن فرداً فرداً پیدا ہوجاتے ہیں، ایسا نہیں کہ کل انسانوں کے لئے کوئی season ہو، نہ تو انسان ایک ساتھ پیدا ہوتے ہیں،اور نہ تو ایک ساتھ مرجاتے ہیں بلکہ فرداً فرداً پیدا ہوجاتے ہیں اور فرداً فرداً مرجاتے ہیں، اسی طرح دنیا میں جو پیغمبر آئے وہ بھی اسی قانون کے تحت آئے یعنی ایک ساتھ پیغمبر نہیں آئے وہ فرداً فرداً آئے اور نہ آسمانی کتابیں ایک ساتھ نازل ہوئیں، مختلف ادوار میں مختلف زمانوں میں انسانوں کی ضرورت کے مطابق آسمانی کتابیں نازل ہوتی رہیں، اسی طرح جن انبیاء و اولیاء کی اور ان کے نمائندوں کی روحانی ترقی ہوئی تھی، وہ بھی ایک ساتھ نہیں ہوئی، فرداً فرداً ان کے اپنے اپنے زمانوں میں روحانی ترقی ہوتی رہی، اسی کے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی قبول کریں گے کہ انفرادی قیامت جو ایک حقیقت ہے وہ بھی ایک ساتھ واقع نہیں ہوتی ہے بلکہ فرداً فرداً آتی ہے [1] جیسے رسول اکرمؐ کا ایک ارشاد ہے قیامت سے متعلق کہ فرمایا: مَنْ مَاتَ فَقَدْ قِيَامَةِ الْقِيَامَة [2] جو مرجاتا ہے اس کی قیامت برپا ہوجاتی ہے، اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں مرنا بھی دوطرح سے ہے، ایک جسمانی موت سے مرجانا، اور دوسرا جسمانی موت سے قبل نفسانی موت سے مرجانا تو پھر اس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ انفرادی قیامت بھی دوطرح سے قائم ہوجاتی ہے، ایک یہ کہ کوئی بندۂ مومن جیتے جی ریاضت کرے، عبادت کرے، اور روحانیت میں آگے سے آگے بڑھے تو اس پر قیامت قائم ہوجاتی ہے، دوسرا یہ کہ انسان اپنے وقت پر جسمانی موت سے مرجاتا ہے تو بھی اس پر شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر قیامت گزرتی ہے تو میں law of nature کی بات کرتا ہوں کہ یہ ثابت کرتا ہوں کہ نہ تو انسان کا پیدا ہو جانا ایک ساتھ ہے اور نہ مرجانا ایک ساتھ ہے، اور نہ قیامت سب کی ایک ساتھ ہے بلکہ ہر واقعہ الگ الگ ہے تو اس سے میری مراد کیا ہے؟ میری مراد یہ ہے کہ خدا نے کسی ایک مقرر وقت میں کن نہیں فرمایا بلکہ وہ ہروقت عالم امر میں کن

۱۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۶: ۹۴)

۲۔ یہ حدیث درج کتابوں میں اس طرح درج کی گئی ہے:

مَنْ مَاتَ فَقَدْ قِيَامَتُهُ۔ ترجمہ: جس کی موت واقع ہوئی، اُس کی قیامت برپا ہوجاتی ہے۔ (کتاب العلاج،علمی علاج:۳۳،۱۵۷، کتاب العلاج، روحانی علاج: ۱۲۳، قرآنی مینار: ۱۵۵، سوسوال اوّل: ۳۹،علمی بہار: ۵۴، تجلّیات حکمت: ۴۲، میزان الحقائق: ۲۹،عملی تصوّف اور روحانی سائنس: ۱۰۱، چہل کلید: ۲۴،عشق سماوی: ۱۰۱، تجرباتِ روحانی: ۱۵۹، ہزار حکمت: ۱۱۵، ۴۰۳، ۴۵۵، صنادیق جواہر:۸۷، ۱۸۰، ۲۸۶، حظیرۃ القدس عالم شخصی کی بہشت: ۲۰، ۱۳۳، قرآنی سائنس حصّۂ اوّل: ۱۲۴، قرآنی سائنس حصّۂ دوئم: ۱۴، ۸۶، قرآن حکیم اور عالم انسانیت: ۱۴۹، قرآن حکیم اور عالم انسانیت حصّۂ دوئم:۷۱، ۱۵۲)

فرماتا ہے، اور اس کن کا زیادہ سے زیادہ تعلق جسمانی امور سے نہیں بلکہ روحانیت سے ہے مطلب اس کا یہ ہے کہ خدا کی بادشاہی اور خدا کی بادشاہی کی ہر چیز ایک ایسے دائرے پر واقع ہے[1] کہ وہ دائرہ بغیر کسی سرے کا ہے، دائرہ یا circle جس کا کوئی سرا نہیں ہوتا ہے، اس مقام پر ذرا اور توجہ سے ایک بات سن لیجئے تو انسان ہمیشہ ایسا کیوں سوچتا ہے، اس کی تلاش کیوں کرتا ہے کہ ہر چیز کے ایک سرے کو پائے، beginning کو پائے، آغاز کو پائے، اس کی وجہ بزرگانِ دین یہ بتاتے ہیں کہ انسان جو اس دنیا میں پیدا ہوا ہے، اس نے ہمیشہ ایسی چیزیں دیکھی ہیں کہ ان کا کوئی آغاز ہوتا ہے، اور وہ انہی چیزوں میں رہ کر یہ سوچنے لگتا ہے جیسا کہ خدا کی بادشاہی کا بھی کوئی آغاز ہے، اور وہ اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ بغیر آغاز کے بھی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں، انسان اپنی عادت سے اور اپنی thinking سے مجبور ہے، اس عالم ظاہر میں جو کچھ وہ دیکھتا ہے وہ ایک ابتدا کے ساتھ دیکھتا ہے مگر وہ وسیع پیمانے پر نہیں سوچ سکتا ہے، اس کے بارے میں پیر ناصر خسرو قدس سرہ کا ایک قول ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

تو بکل بینا نئ زانگہ تو بی راہ ماندۂ تو بکل بینا شوی جان و جسد یکسان تست

تو کل کو نہیں دیکھ سکتا ہے جز کو دیکھ سکتا ہے، اس لئے نظریات اور خیالات میں تو گمراہ ہو گیا ہے، اگر تو کل کو دیکھتا اور کلی طور پر سوچتا تو مان لیتا کہ جس طرح تیری روح کی اہمیت ہے، اس طرح ہمیشہ جسم کی بھی اہمیت ہے، جز کو دیکھنے کی کیا مثال ہے؟ جیسے انسان آسمان کو دیکھتا ہے تو نصف کو دیکھتا ہے، یا اس سے بھی کم کو دیکھتا ہے، جیسے زمین کو دیکھتا ہے تو زمین کے ایک رخ کو دیکھتا ہے اور دوسری جانب کو نہیں دیکھتا ہے، سورج کو دیکھتا ہے تو سامنے کے منظر کو دیکھتا ہے، اور جو پیچھے کا منظر ہے اس کو نہیں دیکھتا ہے، (اسی طرح) چاند ستارے اور ہر چیز کو، اگر سورج کے اس رخ کو بھی دیکھے، چاند کے پس منظر کو بھی دیکھے، پورے آسمان کو سوچے، زمین کے پچھلے رخ کو بھی سوچے، اور اپنی اس پیدائش کے علاوہ آگے کیا تھا، اس کو بھی سمجھے تو تب وہ سمجھ سکتا ہے، تمام چیزوں کو ایک سرے سے وابستہ کرتا ہے حالانکہ قرآن کہتا ہے کہ کوئی سرا نہیں[2] ایسا بھی نہیں کہ خدا نے اپنے امر سے عالم خلق کو پیدا کیا یک طرفہ بلکہ قرآن اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ خداوند ضد سے ضد کو پیدا کرتا ہے، مردے سے زندے کو اور زندے سے مردے کو نکالتا ہے،[3] یہ خدا کی قدرت ہے، اس کا

---

[1] ۔ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (۲۱: ۳۳، ۳۶: ۴۰)

[2] ۔ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (۲۱: ۳۳، ۳۶: ۴۰)

[3] ۔ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُونَ (۳۰: ۱۹)

مطلب یہ ہوا کہ عالم امر سے نہ صرف عالم خلق ہے بلکہ عالم خلق سے عالم امر بھی ہے تو یہ ایک دوسرے سے پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور circle کے یا دائرے کے یہ معنی ہیں، دنیا میں ہم کئی چیزوں کو دیکھتے ہیں جو ایک دائرے پر واقع ہیں، مثال کے طور پر درخت کو دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح ایک بیج سے پیدا ہوتا ہے؟ لیکن صرف یہی نہیں ہے کہ درخت بیج سے پیدا ہوتا ہے بلکہ خود بیج درخت سے پیدا ہوتا ہے، اب کوئی شخص قطعی طور پر یہ فیصلہ نہیں دے سکتا ہے کہ اس میں بیج آگے ہے یا درخت، ماننا پڑے گا کہ یہ تو ایک دائرہ ہے۔

اس میں ہم نے تھوڑی وضاحت ہستی اور نیستی کی کی، اور نیستی کے متعلق ہم نے یہ واضح طور پر ذکر کیا کہ دوسرے لوگ نیستی کو عدم محض مانتے ہیں یعنی ایسی نیستی کہ اس میں کچھ نہیں ہے لیکن ہمارے بزرگان دین نے نیستی کو عالم امر قرار دیا تو دو عالم ہیں ایک عالم امر ہے اور ایک عالم خلق ہے، اگر علم کے سارے نمونے نگاہوں سے اوجھل رہتے تو اس صورت میں انسان کیا پاتا اور کیا سوچتا؟ ایسا نہیں ہے، اس دنیائے ظاہر میں بھی سوچنے کے لئے بہت سی چیزیں ہیں، اور بارہا یہ تذکرہ ہوتا رہتا ہے کہ سوچنے کے لئے تین مقامات ہیں، قرآن ہے، کائنات ہے، اور انسان کی اپنی ذات ہے، مومن کہیں بھی سوچ سکتا ہے، جہاں سوچ کے خدا کی آیات سے حکمت کو سمجھ سکتا ہے، انسان کی ذات تو ایک پوشیدہ چیز ہے، قرآن سے ہر کوئی حکمت کو نہیں سمجھ سکتا ہے، اس لئے جو کائنات ظاہر ہے اگر اس میں سے کسی example کی طرف اشارہ کیا جائے تو بہت ہی ممکن ہے کہ اس سلسلے کا مطلب آسانی سے سمجھ میں آئے، مثال کے طور پر ابھی جو ہم ذکر کرتے تھے کہ اس دنیامیں بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جن میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کا جو قانون ہے وہ دائرے کے موافق ہے، چنانچہ ایک مثال اس دنیائے ظاہر سے یہ ہے کہ بہت سے کیڑے مکوڑے ہیں جن میں پر لگ جاتے ہیں اور رینگنے کے بعد پھر اڑنے لگتے ہیں، پروانے، پتنگیں، خاص کر ریشم کا کیڑا، وہ پہلے کیڑا ہوتا ہے، اور پھر اس کے بعد پروانہ بن جاتا ہے، پروانہ بن کے کہیں غائب نہیں ہوتا ہے، ختم بھی نہیں ہوتا ہے یا تیسرا جانور نہیں بنتا ہے، پھر کیڑا بن جاتا ہے، یہ circle ہے، اور بہت عمدہ مثال ہے، جو کیڑا ہے وہ اس زندگی کی مثال ہے، اور جو پروانہ ہے وہ عالم امر کی مثال ہے یا روح کی مثال ہے، پھر ہمیشہ وہ اسی دائرے پر گردش کرتا رہتا ہے تو یہ ہستی اور نیستی ہے، اور خداوند عالم اس سے بالاتر ہے۔

اسی طرح مکان اور لامکان جو ضد ہیں ان کی تھوڑی سی بات کرتے ہیں کہ مکان اس کائنات کا نام ہے، اور لامکان ایسی کیفیت کا نام ہے کہ وہ اس مکان کے برعکس ہے یعنی وہ مادی طور پر مکان نہیں ہے مگر وہ ایک عالم ہے اور اس میں اپنی نوعیت کی سب چیزیں موجود ہیں، جیسے میں نے ابھی ابھی دعویٰ کیا تھا کہ اس

دنیا سے بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں، اگر ایسا ہے تو لامکان کی کیا مثال مل سکتی ہے؟ اس دنیا سے کس طرح ہم لامکان کو سمجھ سکتے ہیں؟ لامکان کی مثال عالم خواب ہے، اور جب ہم خواب میں جاتے ہیں تو مادیت سے روحانیت کی طرف سفر کر جاتے ہیں تو کوئی چیز ہم اپنے ساتھ اس سفر میں نہیں لے سکتے ہیں، کوئی مادی چیز ہم اپنے ساتھ اٹھا کے اس عالم خواب میں نہیں لے جاسکتے ہیں کیونکہ اس میں مادیت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، وہ مجرد ہے تو آپ دیکھتے ہیں عالم خواب کو کئی کیفیتوں میں کہ اس میں تاریکی بھی ہے روشنی بھی ہے، اچھائی بھی ہے برائی بھی ہے، راحت بھی ہے اور رنج بھی ہے، خوشی بھی ہے غم بھی ہے، سب کچھ (ہے) وہ لامکان کی مثال ہے، لامکان سے مراد کہ وہاں پر space نہیں ہے، مادی جگہ نہیں ہے، مادی چیزیں نہیں ہیں، جسمانی چیزیں نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ایک زندہ کائنات ہے، اور اس میں بہت کچھ ہے عالم خواب میں، اگر مومن علم و عمل سے ترقی کرے تو یقیناً عالم خواب زیادہ سے زیادہ روشن، زیادہ سے زیادہ باشعور اور زیادہ سے زیادہ راحت افزا ہوسکتا ہے، عالم روحانیت کے لئے یہ ایک بہترین نمونہ ہے، اور دنیا سے گزر جانے کے سلسلے میں بھیک کہ جس طرح ایک انسان نیند میں چلا جاتا ہے تو اس میں مرجانے کی مثال ہے کیونکہ شاید بعض عزیزوں کو یاد ہوگا میں نے کبھی عرض کیا تھا کہ عزرائیلؑ فرشتہ نہ صرف موت کے وقت آکر جان کو قبض کرتا ہے بلکہ ساری زندگی میں وہ لگا ہوا ہے کہ سلانے کا جو کام ہوتا ہے، نیند کو مسلط کر دینے اور روح کو مرکوز کرنے کا جو کام ہے وہ عزرائیلؑ کے سپرد ہے[1] چنانچہ یہ نیند بھی مومن کی موت سے مختلف نہیں ہے اس لئے مومن کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اس دنیامیں وہ زیادہ سے زیادہ غور وفکر سے کام لے، اور سوچے اور قرآن حکیم میں خاص طور پر (کیو ۴۳ بی) نیند کا، خواب کا ذکر آیا ہے، اور ایسے بہت سے اشارے ہیں کہ عالم خواب عالم روحانیت سے ملا ہوا ہے، اور عالم روحانیت خواب کے مشابہ ہے یا یوں کہا جائے کہ عالم خواب کی بہت زیادہ ترقی ہوگی تو وہیں پر روحانیت ہوگی۔

خواب کے بارے میں ایک اور مثال یہ ہے کہ خواب کی اتنی ترقی ہوتی ہے کہ اس کو وحی کا مرتبہ مل جاتا ہے لیکن یہ بات سب سے پہلے پیغمبروں کے لئے ہونی چاہیے اور ہاں، قرآن میں ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اپنے بہت ہی عزیز فرزند حضرت اسماعیل علیہ السّلام کو خواب میں ذبح کیا تھا، اسی بنیاد پر انہوں نے اپنے فرزند جگر بند کو قربانی کے لئے لے گیا، اور لے چکنے کے بعد رستے ہی میں اس کا ذکر کرتے

---

[1]- اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا (۳۹: ۴۲)

ہیں،[1] اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ انبیاء علیہم السّلام کا جو خواب ہے وہ کس قدر سچا، روشن اور روحانیت سے بھرپور ہو جاتا ہے، انہوں نے خواب کہا، اگر کہتے روحانیت تو یہ بھی صحیح تھا، اگر کہتے وحی تو یہ بھی صحیح تھا چونکہ اس مقام پر ان حضرات کے لئے مقام وحی اور مقام روحانیت اور عالم خواب ایک ہو جاتا ہے، اگر یہ خواب ان کا معمولی نوعیت کا ہوتا تو اتنے بڑے کام کو کرنے کے لئے وہ ارادہ ہی نہ کرتے، چونکہ ان کا عالم خواب معمولی سطح کا نہیں تھا، اور وہ خواب عالم روحانیت کے مقام پر تھا، اس لئے انہوں نے اپنے اس خواب پر کلی طور سے اعتماد کیا۔

میں کیا عرض کر رہا تھا کہ لامکان کی مثال عالم خواب ہے، اس سے ہم بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں کہ لامکان کیا ہے؟ اور دوسری بات لامکان الگ، عالم امر الگ، آخرت الگ ایسا نہیں ہے، یاد رہے کہ اعلیٰ سطح پر جانے کے بعد ایک ہی حقیقت کے کئی کئی نام ہوا کرتے ہیں، یہی عالم امر ہے، یہی عالم روحانیت ہے اور یہی عالم لامکان ہے۔

اب اس مقام پر تھوڑی سی باتیں خدا کے بارے میں کرنا چاہیں گے، خدا کے متعلق ہمارے بزرگانِ دین نے یہ بتایا کہ یہ جو نام ہیں خدا کے یا یہ جو صفات ہیں خدا کے، یہ صرف خدا سے منسوب ہیں، اور یہ خدا کی خاص صفات نہیں ہیں، کیوں؟ اس کی دو وجہیں ہیں، ایک یہ کہ ان صفات کی اضداد پائی جاتی ہیں، opposites ہیں، مثال کے طور پر "نور" ہرچند کہ النّور خدا کے ناموں میں سے ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نور کا قیام ظلمت پر ہے، ظلمت ہو تو نور ہوگا اس کو رفع کرنے کے لئے، اس کو دور کرنے کے لئے، ایک طرح سے وہ ظلمت سے وابستہ ہے، ظلمت نہ ہو تو نور کی شناخت بھی نہیں ہوگی، ظلمت نہ ہو تو نور کا فعل بھی نہیں ہوگا، اسی طرح اور بھی بہت سے نام ہیں بلکہ سب ہیں، مثال کے طور پر عدل اور عادل، دنیا کے لوگ عدل کو اور عادل کو اس طرح پہچانتے ہیں کہ کوئی ظلم ہو تو انصاف کا تقاضا ہوتا ہے، کسی ظالم سے حق کو واپس دلانے کے لئے عادل کی ضرورت ہوتی ہے، جب تک ظلم کا وجود نہ ہو تو عدل کا تصوّر نہیں ہو سکے گا، اسی طرح خدا کے دوسرے اوصاف ہیں جو خدا سے منسوب ہیں مگر خدا کی ذات کے لئے وہ ضروری نہیں ہیں، اور یہ اوصاف جو ہیں وہ حدود اعلیٰ کے ہیں ہیں، کچھ اوصاف عقل کلّی کے ہیں کچھ نفس کلی کے ہیں، کچھ ناطق کے ہیں، کچھ اساس کے ہیں، اور چونکہ خدا یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کو تعلیم دے اور آہستہ آہستہ ان کو بلند کرے اور ایک اعلیٰ مقام پر

---

[1] فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ○ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ (۳۷: ۱۰۲ تا ۱۰۳)

پہنچنے کے بعد ان کو سمجھائے کہ خدا موصوف نہیں ہے، ہاں چند نام منتخب ہیں خدا کے لئے، ایک تو سبحان پسندیدہ نام ہے، جس کے معنی ہیں پاک، اس طرح قدّوس یعنی پاکیزہ اور پاک اور رحمٰن اور اللہ، احد وغیرہ لیکن یہ بھی وقتی اور ہنگامی ہیں، اور ہمارے بزرگان دین کہتے ہیں کہ کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو خدا کی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے صحیح معنوں میں استعمال ہو سکے۔

بہرحال خدا کے درجات ہیں اور یہ لفظ درجہ بھی اس کے لئے مناسب نہیں ہے لیکن الفاظ کی تنگی یا لفظوں کے نہ ہونے کی وجہ سے انہی الفاظ کو استعمال کیا جاتا ہے، خداوند عالم کے لئے قرآن میں لفظ سبحان آیا ہے[1] اور بعض مترجمین اس لفظ "سبحان" کا ترجمہ اس طرح سے کرتے ہیں کہ "ہر نقص اور عیب سے پاک" ایسا نہیں ہے، خدا کے بارے میں نقص کا اور عیب کا تصوّر کیوں ہونا چاہیے؟ یہ تو بڑی کمزور بات ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ خدا مخلوق کی صفات سے پاک ہے جو بات جو صفت انسانوں میں خوبی ہے وہ خدا کے لئے عیب ہے اس طرح کہنا چاہیے، ایسا نہیں کہ ہر عیب سے ہر نقص سے خدا کو پاک و برتر مان لیا جائے، یہ بہت ہی معمولی تصوّر ہوگا اور اس میں بہت بڑا نقص پایا جائے گا، لہٰذا قرآن کی تعلیم کے مطابق سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۳۷: ۱۸۰) اس آیت میں یہی مطلب ہے جو آپ کے سامنے بیان ہوتا ہے، سُبْحَانَ رَبِّكَ: تیرا پروردگار پاک ہے، رَبِّ الْعِزَّةِ: جو عزت کا پروردگار ہے، دیکھیں عزت کا پروردگار ہے یعنی عزت کو بلند کرنے والا ہے، خدا عزت والا ہے یہ چھوٹی بات ہے، خدا عزت کو پالتا ہے، عزت کو بلند کرتا ہے، بلندی بخشتا ہے، سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۳۷: ۱۸۰) ہر اس چیز سے جو وہ صفت (بیان) کرتے ہیں اس سے پاک ہے، خدا لوگوں کی اس تعریف کو رد کرتا ہے، reject کرتا ہے، کیونکہ ان اوصاف میں جیسا کہ بتایا گیا نقص پایا جاتا ہے، ہر نام میں نقص پایا جاتا ہے، اور یہ اوصاف کہاں سے آئے تھے؟

جیسی زبان بنی تھی، جیسا culture بنا تھا، جیسی تہذیب و تمدن ہوئی تھی اسی کے ساتھ ساتھ نام پیدا ہوئے تھے، پھر لوگوں نے کچھ اپنے خیال کے مطابق اچھی باتوں کو خدا سے منسوب کیا، adopt کیا، خدا نے ایک طرح سے لوگوں کے سمجھانے کے لئے قبول بھی کیا، اور پھر آخر میں اس کو reject بھی کیا، دونوں باتیں ہیں، پہلے قبول کیا بعد میں لوگوں کی سمجھ (میں) آنے کے بعد اس کو نا قبول کیا، اور خود اپنی ذات کو بیچون و بیچگون کہا، کوئی اس کی مثال نہیں ہے، کوئی example نہیں ہے، ہاں جو اس کے مظہر ہیں، جو اس کے نمائندے ہیں اور ان نمائندوں کے جو اوصاف ہیں ان کو اس رشتے سے اور اس نسبت سے قبول کرتا ہے، اَللّٰهُ

---

[1] قرآن میں یہ اسم متعدد بار آیا ہے، اس لئے ان سب کا یہاں قرآنی حوالہ دینا بہت مشکل ہے۔

نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ (۲۴: ۳۵) اس میں خدا نے خود ہی فرمایا کہ اللہ کائنات کی روشنی ہے، اللہ کائنات کی روشنی ہے، یہ تو اس کے مظہر کی صفت ہے، اور خدا اپنے مظہر کی صفت کو اپنا سکتا ہے، مثال کے طور پر قرآن میں ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی نہ کرو جو خدا کے دشمن ہیں جو تمہارے دشمن ہیں،[1] اب یہاں ذرا سوچیں آپ کہ دوستی اور دشمنی برابری میں ہوتی ہے لیکن کون ہے اس کی مخلوق میں جو اس کے ساتھ ہمسری بھی کرے اور دشمنی بھی کرے؟ ایسا کوئی نہیں ہے کہ اگر بحقیقت اس دنیامیں خدا کا کوئی دشمن ہے تو ساری چیزیں خدا کے قبضۂ قدرت میں ہیں، ناراض ہے تو اس کی جان کے رشتے کو دھاگے کو کاٹے، رزق نہ دے، ہلاک کرے، کیونکہ دنیا میں یہی ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ سخت دشمن ہے تو جو کچھ اس سے آتا ہے وہ کرتا ہے، یہ بات نہیں ہے، یہ مجازی بات ہے یا یوں کہا جائے کہ دنیا میں جو دشمن پیغمبر کا ہے اور جو دشمن امام کا ہے، وہی (دشمن) خدا کا ہے جیسے ارشاد نبوی ہے کہا اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ،[2] بار خدایا! علی سے جو دوستی رکھے، تو اس کو دوست رکھنا اور اس سے جو دشمنی کرے تو اس سے دشمن رکھنا۔ بہت سی چیزیں، بہت سی صفات پیغمبر کی ہیں اور امامؑ کی ہیں لیکن خداوند عالم اس کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے، انہی صفات کو اپناتا ہے تو خدا کی توحید بھی بڑی عجیب ہے کہ دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جن کو ہم ایک کہتے ہیں یا واحد مانتے ہیں، کوئی شخص ہے تو ہم اس کو ایک شخص کہتے ہیں حالانکہ وہ ایک مجموعہ ہے اس میں کتنی کتنی اکائیاں ہیں، اس کے اندر جسم اور روح کے اعتبار سے وہ ایک مجموعہ ہے، بہت بڑا مجموعہ ہے، دیکھا کہ لفظوں میں کتنی تنگی ہے؟ اور ان میں جو آخری حقیقت ہے، ان سے اس حقیقت کی ترجمانی نہیں ہوسکتی ہے۔

لہٰذا کیا کرتے ہیں حکمائے دین؟ جو اونچی حقیقتیں ہیں ان کو بیان کرنے کے لئے دو دو لفظوں کو استعمال کرتے ہیں، نفی کو استعمال کرتے ہیں اور اثبات کو بھی استعمال کرتے ہیں یعنی بہت سی باتیں negatively اور positively دونوں طرح سے اس کو بیان کرتے ہیں کیونکہ خدا لا حد ہےاس کی کوئی حد نہیں ہے، خدا کو کوئی شخص لامکان میں محدود نہیں کرسکتا ہے، خدا اسی طرح مکان میں بھی محدود نہیں ہے، خدا کی خدائی کو سمجھنے کے لئے بہت بلندی کی ضرورت ہے، خدا ایک طاقت بھی ہے، خدا ایک وحدت بھی ہے، خدا ایک قانون بھی ہے، قانون! اور قانون کے بارے میں آپ کیا ظاہر کرنا چاہیں گے؟ ایک جمہوریت ہے، اس میں صدر ہے یا minister ہے، parliamentہے یا کوئی شوریٰ ہے، ایوان ہے، ادارے ہیں،

---

[1] یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ (۶۰:۱)

[2] صنادیق جواہر: ۱۴۵، ہزار حکمت: ۴۹۲، وجہ دین جلد دوئم: ۳۹۶، قرآن اور نورِ امامت: ۳۱، کنوز الاسرار: ۱۶۸، جماعت خانہ: ۳۳، ۴۹، قانون کل: ۱۷۶۔

institute ہے وغیرہ وغیرہ، حکومت کس چیز کا نام ہے آپ کے نزد یک ؟ آپ minister کے پاس جاکر پوچھیں گے تو وہ تو بتائے گا کہ حکومت یہ نہیں چاہتی ہے، حکومت یہ کرنا نہیں چاہتی ہے، اس کا کیا مطلب؟ کہاں ہے حکومت؟ عوام ہیں یا assembly ہے یا minister ہے؟ کیا ہے؟ اس کے مختلف اعتبارات ہیں، ایک لحاظ سے سب لوگ ہیں، ایک لحاظ سے assembly ہے، اور ایک لحاظ سے minister ہے یا صدر ہے، اس طرح لفظ اللہ کا اطلاق، لفظ اللہ کا اطلاق کبھی تو law پر ہوتا ہے قانون پر، کبھی بیمثالی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، کبھی اس کا اطلاق نفس کلی پر ہوتا ہے، عقل کلی پر ہوتا ہے، ناطق پر ہوتا ہے، اساس پر ہوتا ہے، امامؑ پر ہوتا ہے، چونکہ وہ لا حد ہے، کبھی اللہ کا اطلاق ایک ایسے تصوّر پر ہوتا ہے کہ اس تصوّر میں آپ کوئی چیز پیش نہیں کرسکتے ہیں، جیسے سبحان اور وحدانیت، پھر آج کے زمانے میں monorealism[1] جو نظریات میں درجۂ آخر پر ہے اور بہت ہی ترقی یافتہ کہنا چاہیے یا یہ کہ اس زمانے کے مطابق آخری راز ہے کیونکہ اگر لوگوں کی، مخلوق کی نفی کریں اور قطعی طور پر نفی کریں، اس کو neglect کریں، اور اس سے الگ خدا کا تصوّر کریں تو ایسا تصوّر صحیح نہیں ہوگا، خدا کی بادشاہی کا تصوّر مخلوق کے بغیر نہیں ہوگا، اور کوئی بھی صفت جو گو کہ عارضی ہیں ثابت نہیں ہوگی لوگوں کے بغیر، "ربّ یعنی پالنہار" اِس کا اطلاق نہیں ہوگا لوگوں کے بغیر، رحمان، رحیم، عادل، کریم، زندہ کردینے والا، مارنے والا، پالنے والا، غفور، غفار، ایسی کوئی صفت ثابت نہیں ہوگی، اور نہ خدا کی بادشاہی کا تصوّر ہوگا، نہ عزت و برتری کا کوئی ثبوت ملے گا، لہٰذا یہ تصوّر کہ monorealism ہے، بہت اچھا ہے، اس لئے کہ یہ سب کے سب ظہورات ہیں، جلوے ہیں، اگر سمندر پر ایک موج اٹھتی ہے گو کہ وہ پھر خاموش ہوجاتی ہے، لیکن پھر بھی وہ سمندر کا ایک جلوہ تو ہے، ایک جھلک تو ہے، ایک حرکت ہے، اور وہ سمندر کی ایک کیفیت ہے، وہ سمندر کا ایک جلوہ ہے، وہ سمندر کا ایک جز ہے، اس کا ایک ظہور ہے۔

اسی طرح خداوند عالم فرماتا ہے کہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (۵۵:۲۹) ہر دور و زمان میں اس کی ایک شان ہوتی ہے، اس کا ایک جلوہ ہوتا ہے، اور وہ کن کا مالک ہے، اور یہ کن کے نتائج ہیں، یہ بھی خدا کی تعریف ہے، اور خدا کے بہت سے نظریات میں سے یہ بھی ایک نظریہ ہے لیکن یہ عمدہ نظریہ ہے، اس لئے بعض صوفی کہتے ہیں کہ یہ بس اپنے آپ ہے، سوالات کب پیدا ہوتے ہیں؟ سوالات اس وقت پیدا ہوتے ہیں کہ خدا اور مخلوق کو الگ الگ مانیں، اور ایک کو طاقتور اور ایک کو کمزور مانیں تو اس سے طرح طرح کے

---

[1] حضرت مولانا الام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ، اسلام میرے مورثوں کا مذہب۔

سوالات پیدا ہوتے ہیں، اگر ہم کہیں کہ بس اپنے میں ہیں، آپ ہیں اور کوئی نہیں ہے، یہ سب جلوے ہیں، یہ سب اس کے تماشے ہیں، یہ سب اس کے ظہورات ہیں، اگر اس طرح سے سوچا جائے تو البتہ کوئی سوال پیدا نہ ہو، اور بے نیازی یعنی کسی چیز کے لئے اس کی حاجت نہیں ہے تو اس صورت میں ہے کہ ہم monorealism کو مانیں۔

بہرحال آخر میں ایک بات یہ کریں گے کہ ہمارے بزرگانِ دین نے علمی طور پر جو کچھ کارنامے انجام دیئے ہیں، وہ وقت اور زمانے کے مطابق ہے، ان کو یوں کرنا تھا کہ دنیا والوں کے لئے ایک مثبت جواب مہیا کریں اور دنیا والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈالیں، اور دنیا والوں سے آگے بڑھ کر علمی طور پر کام کریں، اور زمانے میں جو کچھ ہے، جیسی زبان ہے، اس کے مطابق بات کریں، یہ ہمارے بزرگانِ دین کا اصول رہا ہے، جیسے آپ تواریخ میں دیکھیں گے ایک زمانے میں علم نجوم کی طرف بھی توجہ دی جاتی تھی حالانکہ علم نجوم، اسلام میں اس کے لئے کوئی خاص مقام نہیں ہے لیکن یہ زمانے کی بات تھی، اگر اسلام میں کوئی مقام ہے تو آج اس کے لئے کوئی اہمیت کیوں نہیں ہے اسماعیلی مذہب میں یا کسی اور مذہب میں؟ بات دراصل یہ ہے کہ پہلے شریعت کا دور ہوتا ہے، طریقت کا دور ہوتا ہے، پھر اس کے بعد حقیقت کا زمانہ آتا ہے، اور اسی سے آگے چل کر معرفت ہے، لہٰذا ہمارے بزرگان دین نے جو کچھ لکھا ہے، اس کو سمجھنا ہے، اس کو پڑھنا ہے، اس کو ذہن نشین کر لینا ہے تاکہ لوگوں کے لئے اس سے ایک جواب مہیا ہوجائے، اور ہمارے لئے ایک پل بن جائے کہ ہم قرآن اور امامؑ کی روحانیت میں جاسکیں، اور وہاں سے بہت سی چیزیں اس کے منشاء کے مطابق کہ زمانے میں کیا ہونا چاہیے اور کونسا علم چاہیے، جس سے ہم اپنے وقت میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں، اس کے لئے ہماری رسائی قرآن اور امامؑ سے ہونی چاہیے کہ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی دو مقدس چیزیں ہمارے لئے چھوڑی ہیں، قرآن ہے اور امامؑ، علم کے یہی دو سرچشمے ہیں، اور ہمیں زیادہ سے زیادہ علم الیقین کو سمجھنا ہے، اور اس کے بل بوتے پر ہم عین الیقین کی طرف بڑھیں تاکہ امامؑ مومنین کو عالی ہمتی اور اولوالازمی عطا فرمائے اور پھر اس کے بعد جو توفیقِ خاص ہے، اس سے مومنین کو نوازے، اور ان کو توجہ دے تاکہ وہ امامؑ کی منشاء کے مطابق علم میں اور عمل میں آگے سے آگے بڑھیں۔

شکریہ اگر آپ صاحبان کو کوئی متعلقہ سوال ہے تو پوچھا جاسکتا ہے کیونکہ اصول ہے کہ کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی ہو تو اس کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی ہے، شکریہ۔

فلسفے کی تین اصطلاحیں ہیں، عال علت اور معلول، عال علت بنانے والے کو کہتے ہیں، علت انگریزی

میں شاید cause کہتے ہیں، اور معلول اس کو کہتے ہیں جو علت سے بنتا ہے، ایک چیز سے دوسری چیز بنتی ہے، جو چیز بنتی ہے وہ معلول ہے، اور جس چیز سے یہ بنی ہے، وہ علت ہے، مثال کے طور پر فلسفیوں کے نزدیک اور ہمارے دین میں بھی عقل کلّی پہلی علت ہے کہ اسی سے یہ کائنات اور ہر چیز بنی لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کے بنانے کے لئے بھی کوئی ہونا چاہیے، تو وہ جس نے عقل کلّی کو بنایا وہ عال ہوگا، عال معنٰی علت بنانے والا، علت بنیاد، اصل، بیج کی طرح، مثال کے طور پر اور معلول وہ چیز جو کسی چیز سے پیدا ہوجاتی ہے، مثال کے طور پر فرزند کی علت ماں باپ ہیں، اور اولاد معلول ہے یا اگر قریب سے دیکھا جائے تو بیج علت ہے، اور درخت معلول ہے، یہ سو فلسفے کی چیزیں ہیں۔

مگر توحید کا جو علم ہے یا دین کی جو حکمت ہے، اس کو بھی پھلانگ جاتی ہے، جب ہم چیزوں کو گولائی میں مانتے ہیں تو یہ تصوّر پھر ختم ہو جاتا ہے چونکہ فلسفیوں نے اس کائنات کو اس طرح سے سمجھا ہے کہ پہلے کچھ نہیں تھا، پھر خدا نے کوئی چیز پیدا کی، اور جس چیز کو پہلے پہل خدا نے پیدا کی وہ علت قرار پائی، پھر اسی سے دوسری بہت ساری چیزیں پیدا ہوگئیں، یہ اس تصوّر کی پیدا وار ہیں، اور آپ جب ایک دائرے پر ہر چیز کو ماننے لگیں گے تو پھر اس چیز کی ضرورت نہیں رہے گی لیکن جہاں فلسفے کا مطالعہ کرنا ہے، اور فلسفے کو سمجھنا ہے تو فلسفے کی اصطلاحات کو سمجھنا ضروری ہے یعنی فلسفے کے پیش نظر یہ اصطلاحیں بہت ضروری ہیں، علت ، معلول، عال۔

پیر ناصر خسرو ؒ کی کتابوں میں جو فلسفے کی کتابیں ہیں، ان میں دینی حکمت بھی ہے، اور اہل زمانہ کو انہوں نے جس طرح جواب دیا ہے یا جس شان سے فلسفے کو پیش کیا ہے، اس کے مطابق بہت ساری کتابیں ہیں تو ان کتابوں میں یہ اصطلاحات اور یہ باتیں آتی رہتی ہیں، مہربانی۔

ٹائپ ونظرِ ثانی: احمد ندیم سمویو

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ حدید

کیسٹ نمبر: Q-44　　　تاریخ: ۵/۱/۱۹۸۴ء کراچی

Click here for Audio

یا علی مدد!

عزیزانِ من! آج کوشش ہے کہ آپ عزیزوں کے سامنے سورۂ حدید کی کچھ حقیقتوں کے بارے میں عرض کی جائے۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡـمٰنِ الرَّحِیۡـمِ [سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَالۡاَرۡضِ وَھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِـیۡمُ] ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے لئے تسبیح کرتا ہے، اور وہ غالب ہے، اور حکمت والا ہے (۵۷:۱)۔ اِس پاک و پاکیزہ ارشاد میں سب سے پہلے ہمیں تسبیح کے بارے میں جاننے کی ضرورت ہے، کیونکہ کائنات کے ظاہر اور باطن میں جو کچھ ہے وہ ایک جیسا نہیں ہے، اِس لئے کہ سب سے پہلے تو ملائکہ ہیں، ارواح ہیں جنّات ہیں، شیاطین ہیں، انسان ہیں، حیوانات ہیں، نباتات اور پھر سب سے نیچے جمادات، تو یہ تمام مخلوقات ایک جیسی نہیں ہیں بلکہ مختلف ہیں، تو پھر کس طرح ہم اِس کو سمجھ سکیں کہ یہ تمام چیزیں ایک ہی طرح سے اور ایک ہی شان سے خداوندِ عالم کی تسبیح کرتی ہیں۔ اِس کے لئے جواب کچھ اِس طرح سے ہے، کہ تسبیح کئی طرح کی ہے وہ شعوری ہے، اور غیر شعوری ہے، وہ زبانِ حال سے بھی ہے، اور زبانِ قال سے بھی، وہ بغیر معرفت کے بھی ہے اور معرفت کے ساتھ بھی ہے۔ چنانچہ ہر مخلوق اپنی حالت اور حیثیت کے مطابق تسبیح کرتی ہے، اور اِس تسبیح کے کرنے سے اِن کے درجات میں کچھ فرق نہیں پڑتا اور تسبیح کا مطلب یہ ہے، کہ ہر چیز خدائے سبحان کو اپنی حالت و کیفیت سے برتر قرار دیتی ہے، اِس کے یہ معنی ہیں کہ خدا اپنی مخلوق کی صفت سے پاک و برتر ہے۔ تسبیح کے بارے میں دوسرا نکتہ یہ ہے، کہ عالم ذرّ جو شخصی دنیا ہے اُس میں بصورتِ ذرّات کائنات سموئی ہوئی ہے، وہاں پر تمام چیزوں کے ذرّات یک زبان ہو کر خدا کی تسبیح کرتے ہیں وہ ایک رُوحانی آواز ہے اور بغیر لفظ کے وہ ایک گونج ہے۔

پھر ارشاد ہے، کہ [لَـہٗ مُلۡكُ السَّمَاوَاتِ وَالۡاَرۡضِ یُحۡیِیۡ وَیُمِیۡتُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝ ھُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالۡبَاطِنُ ۚ وَھُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِـیۡمٌ] آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے یعنی خداوندی، اور اِس کا ربط اگلی آیت کے ساتھ یوں ہے، کہ ایسے مقام پر خدا کی بادشاہی کی شناخت حاصل ہو جاتی ہے اور ارشاد

ہے کہ وہ ہی جِلاتا ہے، وہ ہی مارتا ہے، اور وہ ہی ہر چیز پر قادر ہے، وہ ہی سب سے اوّل ہے، وہ ہی سب سے آخر ہے، اور وہ ہی سب سے ظاہر ہے، اور وہ ہی سب سے باطن ہے، اور وہ ہی ہر چیز کو جانتا ہے (۵۷: ۲۔ ۳)۔ اِس مقام پر چار آمنے سامنے کی صفات کا ذکر آیا یعنی اوّل و آخر اور ظاہر و باطن، جب ہم دیکھتے ہیں، اپنی محدود عقل کے مطابق تو اُس میں بات یوں بنتی ہے کہ جو چیز اوّل ہے اُس کو صرف اوّل ہونا چاہئے اور جو چیز آخر ہے، وہ اوّل نہیں ہوسکتی ہے، اور جو چیز ہر لحاظ سے ظاہر ہے وہ باطن نہیں کہلاسکتی ہے اور جس چیز کو باطن کہنا چاہیے تو اُس کی یہ وجہ ہونی چاہیے کہ وہ ظاہر نہیں ہے۔ لیکن خداوندِ عالم نے یہ جو چار صفات اپنے لئے بیان کی ہیں، یہ بہت ہی اِس منطق سے عجیب اور پُرحکمت ہیں، بے شک وہ اوّل ہے، اِس معنیٰ میں کہ وہ مخلوق سے اور ہر چیز سے اور ہر اعتبار سے اوّل ہے، بغیر اِس کے کہ اُس کی کوئی اوّلیت ہو یعنی بغیر کسی ابتداء کے، تو اوّل ہے یعنی وہ اِس معنی میں اوّل نہیں ہے کہ اُس کا کوئی آغاز ہو، کوئی ابتدا ہو، نہ کہ وہ کسی آغاز کے بغیر کسی ابتداء کے بغیر اوّل ہے۔ جیسے ہم بعض دُعاؤں میں کہتے ہیں یا اوّل الاوّلین کسی اوّل سے مقدّم اور پہلے ہونے کے معنی میں اوّل کی یہ صفت ہے، نہ کہ کسی آغاز اور ابتداء کے معنی میں، اور آخر کے معنی میں بھی یہی حکمت ہے، کہ ہر چیز فنا ہو جائے گی لیکن اس کی ذات باقی رہے گی تو وہ اِس معنی میں آخر ہے "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ" (۲۸: ۸۸) یعنی وہ اپنی تمام مخلوق سے آخر ہے، اور ظاہر کا مطلب یوں ہے کہ وہ کئی معنوں میں ظاہر ہے، اور اِس لیے بھی کہ وہ نور ہے، اور نور کی صفت یوں بیان کی جاتی ہے، نور کی تعریف یہ ہے کہ وہ ظاہر ہے اور چھپی ہوئی چیزوں کو ظاہر کر سکتا ہے، یہ نور کی تعریف ہے، اور باطن کا مطلب یہ ہے کہ وہ احساس و ادراک سے باطن ہے کہ کوئی مُدرِک از خود اپنے آپ اُس کا ادراک نہیں کرسکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے "لَّا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ" نظریں اُس تک رسا نہیں ہوسکتی ہیں اور وہ نظروں کو پاتا ہے یا کہ اُس کی رسائی نظروں تک ہو جاتی ہے (۶: ۱۰۳) اِس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ جہاں خداوند کا دیدار ہوتا ہے، اور جیسی اُس کی معرفت حاصل ہوتی ہے، یہ کسی انسان کی کوشش سے نہیں ہے، بلکہ یہ اُس وسیلے سے ہے، جو اُس نے مقرر کیا ہے۔ جیسے مادّی مثالوں میں سے ایک مثال سورج کی ہے، کہ کوئی شخص سورج کو اپنی نظروں کی رسائی سے نہیں دیکھ سکتا ہے، بلکہ سورج جو ہماری نگاہوں کے استقبال کے لیے آتا ہے، یعنی اُس کی روشنی جو بڑی سرعت کے ساتھ سرچشمے سے بکھر جاتی ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ سیارۂ زمین کی طرف بھی روشنی اپنی خاص رفتار سے آتی ہے، تو اسی کے بدولت ہم سورج کو دیکھ سکتے ہیں۔ اِس لیے خدا کے باطن ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہے، اور جہاں وہ ظاہر ہے، تو اپنی قوت سے اور اپنے نور سے وہ ظاہر ہے، ایسا نہیں ہے کہ اسکو کسی نے ظاہر کیا ہے۔ اِس کے علاوہ ایک اور تاویل ہے، کہ خدا کی صفات کا اطلاق اعلیٰ حدود پر ہوتا ہے اور جیسے حدود اِن صفات میں موجود ہے، تو اِس کی نسبت خدا کے لیے ہوتی ہے یعنی خدا اِن صفات کو جو حدود دین میں ہیں اپنی ذات سے منسوب کرتا ہے۔

[''هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ''](۵۷:۴)۔اُس کے بعد تخلیق عالم دین کا ذکر آتا ہے،کہ اُس نے چھ ادوار میں عالم دین کو پیدا کیا جس کا بار بار ذکر ہوتا رہتا ہے،اور عالم دین کی تخلیق و تکمیل کے بعد وہ عرش کی طرف متوجہ ہوگیا،اور اِس سے قائم القیامت کا دَور مراد ہے۔اِس تاویل کی مناسبت سے کہ جہاں چھ دنوں میں عالم دین کو پیدا کیا اور چھ دنوں سے چھ ناطق مراد ہیں یعنی چھ بڑے پیغمبر تو اسی مناسبت سے ساتویں دن جو خدا عرش کی طرف متوجہ ہوا،تو اُس کی تاویل ہے،کہ اِن چھ بڑے پیغمبروں کے بعد حضرتِ قائم القیامت کا دور آیا اور اس میں گویا خدا عرش پر متمکن ہوا تو وہ دور ایک ایسا دور ہے جس میں کہ خدا نے اپنے علم کو یعنی عالم دین کو مکمل کر دیا ہے اور وہ دور احکام صادر فرمانے کا نہیں ہے،بلکہ ہر کسی کو اجر وصلہ اُس کے عمل کے مطابق دینے کا دور ہے۔اِس کے علاوہ اِس سے یعنی یہ بھی ظاہر ہے،کہ یہ دور عظمتوں کا،بزرگیوں کا اور راز کے افشاء ہو جانے کا دور ہے،کیونکہ یہاں عرش سے مراد نورِ عقل ہے،نورِ علم ہے اور عرش سے مراد معرفت ہے اور پھر نفوس کی برتری ہے۔

اُس کے بعد خداوندِ عالم کا ارشاد ہے،کہ خداوند جانتا ہے،جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو زمین سے خارج ہوتی ہے اور جو کچھ آسمان سے نازل ہوتا ہے اور جو کچھ آسمان میں بلند ہو جاتا ہے۔اِس کا مقصد یہ ہے،اِس کا مفہوم یوں ہے،کہ انسان کے باطن کی زمین سے اور اُس کی رُوحانیت کے آسمان سے ہمیشہ چیزیں نازل ہوتی رہتی ہیں اور زمین سے چیزیں بلند ہوتی رہتی ہیں تو رُوحانی اور عقلی حرکت ہر وقت جاری ہے،ہر چند کہ انسان اِن واقعات سے بے خبر ہے،لیکن انسان بجائے خود ایک دنیا ہے اور اِس دنیا کے آسمان ہیں اِس کی زمین ہے،لہٰذا آسمان اور زمین کے مابین چیزوں کا آنا جانا اور داخل ہو جانا اور خارج ہو جانا ہر وقت جاری اور ساری رہتا ہے۔اِس لیے کہ قرآن میں جہاں کہیں ایسا لگتا ہے کہ یہ کائنات کا،کائناتِ ظاہر کا ذکر ہے،دنیائے ظاہر کا ذکر ہے،تو ایسا نہیں ہے۔چونکہ اِس کائنات سے انسان مقصود ہے لہٰذا خود انسان کی ذات کا اِس میں تذکرہ ہوتا رہتا ہے اور جب کہ انسان بجائے خود ایک آسمان ہے،اور بذاتِ خود ایک زمین ہے،تو اِس آسمان و زمین کا ذکر ہوتا رہتا ہے،تاکہ جو اہلِ دانش ہیں اُن کو خدا کا کوئی راز ملے اور اُن کی ہدایت ہو،اُن کی ترقی ہو۔جیسا کہ یہاں پر ہے'' وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ''اور خدا تمھارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو،تو اِس میں خداوندِ عالم کی توجہ خاص انسان کی طرف ہے،نہ کہ اِس مادّی کائنات کی طرف اور اگر مانا جائے کہ خدا ہر وقت انسان کے ساتھ ہے،اور خاص طور پر مومن کے ساتھ ہے،تو یہ بھی ماننا پڑے گا جہاں پر خدا ہے وہاں پر عرش بھی ہے،کرسی بھی ہے،لوح و قلم بھی ہے،ملائکہ بھی ہیں اور قیامت بھی ہے اور ہر چیز اور خدا کے جملہ خزانے بھی ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو خدا سے الگ ہو اور خداوندِ عالم جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو اور دیکھتا ہے۔

[''لَـهٗ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ''(۵:۵۷)]اسی کی ہے آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی ۔آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی ،بظاہر ایسا نہیں لگتا ہے کہ یہاں خدا کی کوئی بادشاہی ہے، دیکھنے والے جو چشمِ ظاہر سے دیکھتے ہیں، اِس دنیا کو دیکھتے ہیں، دنیا کے لوگوں کو دیکھتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا کے لوگ حکمرانی کرتے ہیں ۔مگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے چشمِ بصیرت سے نگاہ ڈالی جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی بادشاہی ہے، جیسے قصۂ ابراہیم میں آیا ہے خداوندِ عالم نے ابراہیم کو آسمان وزمین کی ملکوت کا مشاہدہ کرایا اور اِس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ جہاں کائنات کی بادشاہی کا یعنی خدا کی بادشاہی کا ذکر آتا ہے، تو اُس سے یہ اُمید دلانا مقصود ہے کہ مومنین کو خداوندِ عالم اپنی بادشاہی سے نوازے گا۔ بظاہر یہ بات بہت بڑی لگتی ہے کہ مومنین کو خدا کی بادشاہی حاصل ہو گی لیکن بحقیقت دیکھا جائے تو یہ بات دُرست ہی ہے ۔اِس لیے کے جہاں قرآن میں بہشت کا ذکر فرمایا گیا ہے، تو بہشت کی واقعیت یعنی بہشت کے مکان یا کہ اُس کی وسعت کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ بہشت کائنات کے طول وعرض میں واقع ہے (۳: ۱۳۳، ۵۷: ۲۱) ۔اِس کا مطلب یہ ہوا کہ بہشت خدا کی باشاہی کا دوسرا نام ہے، پس یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ خدا کی بادشاہی مومنوں کو بصورتِ بہشت یا بعنوانِ بہشت حاصل ہو جاتی ہے، اور بندۂ مومن کے لیے اِس میں کیا شک ہوسکتا ہے، جہاں پر کہ خدا بندۂ مومن کو اپنی ذات سے واصل کر کے اپنی جملہ صفات سے نوازنے کا ذکر فرماتا ہے، تو وہاں بہشت کی صورت میں کائنات کی بادشاہی کے عطا کرنے میں کیا شبہہ ہوسکتا ہے ۔

اِس کے بعد ارشاد ہے کہ ''وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ''اور تمام امور خدا کی طرف رُجوع ہو جاتے ہیں، اِس کے یہ معنی ہیں، کہ چیزوں کا ایک مرجع ہے بازگشت ہے اور وہ بازگشت یا کہ (destination) یا کہ معاد مقامِ عقل ہے ، کیونکہ جملہ فیصلے عقل ہی کے تحت ہوا کرتے ہیں، اور ہر گرہ اسی مقام پر کُھل جاتی ہے، ہر بھید نورِ عقل سے ظاہر ہو جاتا ہے، اور جزا وسزا بھی میزانِ عقل کے مطابق ہے، لہٰذا تمام امور کا رُجوع مقامِ عقل پر ہے، تو یہ رجوع بھی دو طرح سے ہے ۔ایک رجوع شعوری طور پر ہے، جس میں رجوع کرنے والا جانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اُس کا رجوع ہو گیا دوسرا رجوع لاشعوری طور پر ہے اور ایسا رجوع کسی ایک فرد کے پیشِ نظر سے ہے اور اُس کے اعتبار سے ہے، یعنی یہ تو قانون ہے کہ خدا کے حضور میں فرداً،فرداً جایا جاتا ہے، یعنی تنہا تنہا جانا ہوتا ہے، مگر یہ تنہائی دوسرے اعتبار سے ایک پوری دنیا ہوتی ہے، مگر کیسی دنیا! مادّی یا رُوحانی نہیں !ہاں !عقلی دنیا ہوتی ہے ۔جس طرح مادّی دنیا میں کثرت ہوتی ہے اور اُس میں بہت سے افراد ہوتے ہیں اور جس طرح رُوحانی دنیا میں کسی قدر وحدت ہوتی ہے، پھر بھی وہاں پر ذرّات پائے جاتے ہیں ۔اسی طرح مقامِ عقل پر وحدت کی انتہا ہو جاتی ہے اور اسی ایک وحدت کے اندر ایک دنیا موجود ہوتی ہے ۔ہم جب باور کرتے ہیں کہ کثرت میں ایک دنیا ہے جو مادّی عالم ہے، اور روحانیت میں ایک دنیا ہے، جو ذرّات ہیں، تو اسی طرح ہمیں باور کرنا

چاہیے کہ مقامِ عقل پر بھی ایک دنیا ہے مگر وہ دنیا بکھری ہوئی نہیں، انتہائی منظم اور انتہائی اتحاد کی صورت میں ہونے کی وجہ سے وہاں محض ایک توحید ایک دنیا کو (represent) کرتی ہے، تو اُس صورت میں ایک انا کو چھوڑ کر باقی سب انائیں اور تمام چیزیں جو وہاں عقلی کیفیت میں موجود ہیں، ان سب کا وہاں پر رُجوع ہو جاتا ہے، اُس تنہا فرد کے اعتبار سے اسی طرح ہر بار اللہ کے حضور میں رجوع ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے کہ قیامت کوئی ایک وقتِ معین کا نام نہیں ہے، یہ تو ایک سلسلہ ہے، جس کی تشبیہہ گھڑی سے دی گئی ہے، کہ قیامت کو ''السَّاعَۃَ'' کہا گیا ہے اور ''السَّاعَۃَ'' کوئی ٹھہری ہوئی چیز نہیں ہے، بلکہ ایک حرکت والی شئ ہے۔ اِس لئے نہ تو کلمۂ کن کسی ایک وقت کے لئے مقرر ہے، نہ قیامت اور نہ رجوع، یہ ساری چیزیں خدا کی بادشاہی میں رواں دواں ہیں اور اسی طرح ہر چیز کا رجوع عقلی کیفیت میں ہو جاتا ہے۔

پھر ارشاد ہے کہ [يُوْلِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ۚ وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۵۷:۶)] خداوندِ عالم رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔ قرآن میں یہ کلمہ بار بار آتا ہے، مختلف اندازوں سے یا مختلف طریقوں سے خداوندِ عالم دن سے رات کو نکالتا اور رات سے دن کو بھی فرمایا جاتا ہے، کہ خداوندِ عالم نے دن میں رات کو رات کو دن میں پوشیدہ رکھا ہے اور پھر فرمایا جاتا ہے خدا وہ ذات ہے جو حیات سے موت کو اور موت کو حیات سے نکالتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جتنی اضداد ہیں وہ ایک دوسروں کو جنم دیتی ہیں، جیسے قیامت سے، آخرت سے دنیا اور دنیا سے آخرت ظاہر ہے کہ ہم عالمِ روحانی سے آئے ہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہم عالمِ روحانی میں جائیں گئے، ہماری وہ ہستی جو مستقبل میں بننے والی ہے آخرت میں، وہ اِس دنیا کی بدولت بن جائے گی جیسے ہم اِس بات کو مانتے ہیں کہ ہماری رُوح عالمِ آخرت سے آئی ہے، تو اِس میں ہم مان گئے کہ ہماری روح جو ہے عالمِ آخرت سے ہے اور اسی طرح اِس کو بھی ماننا چاہیے ہماری جو آخرت میں، بہشت میں جو ہستی بنے گی وہ اِس دنیا کے طفیل سے ''اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ'' ہم اپنے وجود کو اِس دنیا کے اعمال کے بدولت بنائیں گئے بلکہ جنّت کو بھی اپنے اعمال سے بنائیں گئے، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ آخرت دنیا سے بنتی ہے اور دنیا آخرت سے بنتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہستی نیستی سے، اور نیستی ہستی سے ہے۔ نیستی سے کس طرح ہستی بنی؟ اِس میں تو کسی کو کوئی شک نہیں ہے، لیکن سوچنا اِس میں ہے، کہ کس طرح نیستی ہستی سے بنی ہمارے بزرگانِ دین نے بہت سی مشکلات کو آسان کر دیا ہے، امام کی مہربانی سے اور انھوں نے یہ بڑا راز کھول کے بتایا کہ عدمِ محض نہیں ہے، عدمِ محض کا تصور نہیں ہے۔ جس حقیقت کا نام نیستی ہے، وہ قطعی نیستی نہیں ہے، بلکہ وہ عالمِ امر ہے، یعنی وہ ایک ایسی لطیف ہستی ہے، کہ جو نظر نہیں آتی ہے، اپنی لطافت کی وجہ سے۔ دنیا میں مادّی طور پر بھی جب ہم دیکھتے ہیں تو بعض لطیف چیزیں نظر نہیں آتی ہیں مثلاً عناصر کو لیجئے مٹی جو سب سے کثیف ہے، تو نمایاں ہے اور پانی اِس سے نسبتاً لطیف ہے یا یہ کہا جائے کہ وہ لطیف بھی ہے، کثیف بھی ہے، پانی جس پہلو سے لطیف ہے اسکی بدولت ہم پانی میں اپنی شکل کو دیکھ سکتے ہیں، بعض دفعہ

پانی کو عبور کر کے ہماری نگاہ تہہ تک جاتی ہے اور پانی کے نیچے جو چیزیں ہیں اُن کو دیکھتے ہیں یہ ثبوت ہے پانی کی لطافت کا۔اب ہوا اِس سے زیادہ لطیف ہے کہ ہوا کو ہم نہیں دیکھ سکتے ہیں جب تک کہ اُس میں گرد نہ ملے یا بادل نہ ملے جب ہوا خالص ہے، تو ہم اُس کو دیکھ نہیں سکتے یہ ثبوت ہے اِس حقیقت کا کہ لطیف چیزیں جو ہیں وہ نظر نہیں آتی ہیں۔اسی طرح ایک انتہائی لطیف ہستی ہے جس کو نیستی کہا گیا، اور وہ ہے ہستی، اور اُس میں جو کُن ہے وہ کارفرما ہے، کہ اُس لطیف ہستی کا ظہور کُن سے ہوتا ہے، تو اِس کو کہتے ہیں کسی چیز کو کُن کے ذریعے ہستی میں لانا۔حالانکہ یہ (nothingness) سے نہیں ہے، ایک نادیدہ شے کو بذریعۂ کُن سامنے لانے کی بات ہے، حاضر کرنے کی بات ہے۔اب اِس سے ہمارے نظریات پر کیا اثر پڑا؟ ہمارے نظریات پر اِس تصور سے بہت بڑے بڑے اثرات مرتب ہو گئے اور ایک بنیادی اثر یہ ہے، اب ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ کسی وقت میں ہستی نہیں تھی یا کائنات نہیں تھی یا رُوح نہیں تھی یا خدا کی بادشاہی نہیں تھی یا عرش نہیں تھا، تب خدا نے اُس کو عدمِ محض سے یعنی (complete nothingness) سے چیز کو وجود میں لایا یہ تصور ہم اب نہیں رکھ سکتے ہیں، کیوں کہ ابھی ہم نے جو بات کی اُس سے یہ پتا چلا کہ یہ تو ایک دائرہ بن گیا، ایک طرح سے وہ انتہائی لطیف وجود ہے جس کو لوگوں نے نیستی مانا، یا تو اُن کی نارسائی کی وجہ سے یا تو اُس پر حکماء نے اور اللہ نے پردہ ڈالا تھا اور اِس کا نام نیستی رکھا تھا، کیونکہ وہاں پر چونکہ مادّہ نہیں ہے اور کوئی شے نہیں ہے، وہ بالکل یا کہ (nothingness) کی طرح ہے۔لیکن حقیقت میں وہ (nothingness) نہیں ہے۔اسی کا دوسرا لفظ ہستیٔ نیستی نما ایک ایسی ہستی جو نیستی لگتی ہے، یہ عالمِ امر ہے، تو ایک طرف عالمِ امر ہے اور دوسری طرف عالمِ خلق ہے، تو دائرہ بن گیا اور دائرہ بن جانے کے بعد جو (end) ہے وہ گم گیا جو سرا ہے وہ لاپتہ ہو گیا اور ہمیشہ سے اِس کا کوئی سرا نہیں ملا، اِس کا کوئی سرا نہیں ہے۔لہٰذا اور جہاں خدا جب بھی کچھ فرماتا ہے تو اُس سے یوں لگتا ہے کہ کوئی سرا ہے، یہ تو ہماری نارسائی کی بات ہے، ہماری محدود عقل کی بات ہے یا یہ کہ ہمیں سمجھانے کے لیے ہے، رفتہ رفتہ ہمارے شعور بلند کرنے کے لیے ہے کیونکہ دیکھیں کہ ہمارا ذہن بکھر جائے تو ہم کہیں کے نہیں رہ جائیں گے اور یہ (nature) ہے کہ کسی چیز کو وجود دینا ہے تو اُس کو سانچے میں رکھا جاتا ہے، دائیں، بائیں سے آگے پیچھے سے اُس کو (press) کر کے چار دیواری جیسی بنا کر سانچے میں رکھنا ہوتا ہے، تو تب کسی چیز کا وجود بنتا ہے، اگر آپ کسی چیز کو بکھیرتے ہیں، تو وہ چیز نیست و نابود ہو جاتی ہے۔

اِس لیے اِن بھیدوں کی طرف جانے سے قبل ہمارے جسمانی، رُوحانی اور عقلی وجود کو بننے دیجئے اور اِس کو سانچے میں رکھیئے، اِس کو (mold) ہونے دیجئے تا کہ بعد میں یہ سوچیں گے، کہ یعنی خدا کی بادشاہی کا کوئی سرا ہے یا نہیں ہے، تو اِس سے ظاہر ہے کہ عالمِ امر ایک طرف ہے اور عالمِ خلق ایک طرف ہے، تو عالمِ امر سے عالمِ خلق کی چیزیں بنتی ہیں اور عالمِ خلق سے عالمِ امر کی چیزیں بنتی ہیں، تو اِن دونوں کو خدا نے جفت بنایا ہے اور جفت کئی طرح کی ہوتی ہیں، اُن میں ضد کے طور پر

بھی جفت ہے، جیسے دنیا میں جانور ہیں، انسان ہیں، اور جن کے جوڑے ہیں نباتات کے بھی جوڑے ہیں۔ اِس طرح علمی چیزوں کے بھی جوڑے ہیں، اضداد ہیں لیکن یہ اضداد ایک دوسرے کے لیے معاون ہیں، ایک دوسرے کو جنم دیتی ہیں، ایک دوسرے کے لیے شناخت کا ذریعہ بن جاتی ہیں جیسے ارشاد ہے، کہ ''تُعْرَفُ الْاَشْيَاءُ بِاَضْدَادِهَا'' چیزوں کی شناخت اِن کی اضداد سے ہو جاتی ہے، سفید کاغذ پر خلافِ رنگ سے، خلافِ روشنائی سے لکھا جا سکتا ہے۔ سفید پر سفید تحریر نہیں بنتی ہے، سفید رنگ کی اور سفید روشنائی کی تحریر نہیں بنتی ہے، اِس لیے خداوندِ عالم نے اِس عالمِ امر کو نیستی کے مشابہ بنایا مگر ہے وہ ہست لطیف تو یہ ہے، کہ قرآن میں دن رات کے آپس میں ضد ہونے اور ایک دوسرے سے پیدا ہو جانے کا ذکر آجاتا ہے یا ایک دوسرے میں چھپ جانے کا ذکر آجاتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اِس دنیا میں آخرت پوشیدہ ہے، خداوندِ عالم اہلِ ایمان سے فرماتا ہے، کہ ایمان لاؤ خدا پر اور رسول پر۔ دیکھیے کہ ایک سوال ہے، کہ جن لوگوں نے ایمان لایا ہے اُن سے فرمایا جاتا ہے، کہ تم ایمان لاؤ، حالانکہ بظاہر دیکھا جائے تو جن لوگوں نے ایک بار ایمان لایا ہے اُن سے یہ تقاضا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ایمان لائے۔ اِس سے ظاہر ہے، کہ ایمان کے مراتب ہیں، ایمان کے درجات ہیں اور ایمان کا ایک درجۂ کمال ہے، جب تک مومن درجۂ کمال تک نہیں پہنچتا ہے، تو اُس سے یہ بار، بار تقاضا ہوتا رہتا ہے کہ وہ ایمان میں آگے بڑھے اور نورِ ایمان کو حاصل کرے نہ صرف ایمان بلکہ ہدایت بھی علم بھی اور ہر چیز جو ہے اپنا ایک پھیلاؤ رکھتا ہے، ایک سلسلے کی طرح ایک راستے کی طرح یا کچھ مراتب کی طرح، تو اِس لیے مومن یقین ہو یا ایمان علم ہو یا ہدایت تو اُس میں آگے بڑھتا ہے اور ہادیٔ برحق کی رہنمائی میں وہ درجۂ کمال کی طرف آگے بڑھتا ہے اور آگے بڑھ جانے کی امکانیت ہوتی ہے، اِس لیے خداوندِ عالم نے اہلِ ایمان سے فرمایا کہ تم ایمان لاؤ۔

پھر ارشاد ہے کہ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ (۵۷:۷) خدا پر ایمان لاؤ اور رسول پر صحیح معنوں میں جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے اور خرچ کرو اُس چیز سے جس میں کہ تم کو ہم نے جانشین بنایا ہے یعنی اِس روئے زمین پر تم سے پہلے بہت سے لوگ بستے تھے اور اُن کی جگہ پر ہم نے تم کو بسایا ہے یا دین میں، علم میں، ہم نے تم کو یہ امکانیت دی ہے، تو اِس لیے تم کو اپنی مادّی اور رُوحانی دولت سے خرچ کرنا چاہیے'' فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ''جن لوگوں نے خدا کے منشاء کے مطابق ایمان لایا تم میں سے، اِس میں مسلمین اور مومنین خدا کے اِس ارشاد کے سامنے ہیں، تم میں سے جن لوگوں نے خدا کی رضا کے مطابق یا اُس کی مشیّت کے مطابق ایمان لایا اور اور جنھوں نے خرچ کیا، تو اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔

''وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ ''اور تمھیں کیا ہوا ہے؟ کہ باور نہیں کرتے ہو یا ایمان نہیں لاتے ہو جیسا کہ ایمان لانا چاہیے بِاللّٰهِ ''خدا پر'' وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ ''اور رسول تمھیں دعوت دیتا ہے'' لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ ''کہ تم اپنے پرور

دگار پر ایمان لاؤ یہ مسلمین و مومنین سے خطاب ہے،"وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ "اور اِس پر تم سے عہد و میثاق لیا گیا ہے، عہد و پیمان لیا گیا ہے، اگر تم مومن ہو تو اِس عہد و پیمان کا خیال رکھو(۵۷:۸)۔"ھُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِہٖ اٰیَاتٍ بَیِّنَاتٍ لِّیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ "دیکھیں کے جن سے خطاب ہوتا ہے، اُن سے فر مایا جاتا ہے، کہ اللہ وہ ہے، جس نے اپنے بندے پر آیت نازل کیں جو روشن ہیں، یعنی معجزات اور دلائل اور اِن نشانیوں کے نزول کا مقصد یہ ہے، کہ تم کو تاریکی سے روشنیوں کی طرف لایا جائے" وَاِنَّ اللّٰہَ بِکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ 'اللہ تم پر بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے(۵۷:۹)اِس سے ظاہر ہے، کہ جن مسلمین کے ساتھ قرآن مخاطب تھا، اُن کو خداوندِ عالم، کلی طور پر روشنی کی طرف لے آنا چاہتا تھا اور اِبھی وہ مکمل طور سے روشنی میں نہیں تھے، یعنی اُن کو نور کی شناخت کروانا چاہتا تھا۔

"وَمَا لَکُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلِلّٰہِ مِیْرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ "اور تمہیں کیا ہوا ہے؟ کہ تم راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے ہو اور حالانکہ آسمانوں اور زمین کی میراث خدا ہی کو ہے(۵۷:۱۰)۔ یہاں پر ایک بات قابل توجہ ہے، اِس میں کسی کو کوئی شک نہیں کہ آسمان اور زمین کی میراث اللہ کی ہے۔ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ کی ہے تو اللہ بے نیاز ہے، یہ وہی بات ہے، جو کہی گئی تھی کہ اللہ کی جتنی چیزیں ہیں وہ عطا کر دینے کے معنی میں ہیں، جیسے اُس کے بادشاہی کا ذکر ہوا تھا۔ میں ایک نکتہ آپ کو بیان کرنا چاہتا ہوں، شروع سے لے کر اب تک جتنے مذاہب بنے ہیں، تو اِس سلسلے میں ہر مذہب میں شروع میں جب نور اُس کے پاس تھا، جب پیغمبر سامنے تھا یا جب کوئی امام سامنے تھا، تو ایسی ایسی عمدہ دلیلوں کو اپنا لیا، ایسی اچھی باتوں کو کہ وہ جواہرات سے زیادہ قیمتی تھیں۔ لیکن جب پیغمبر دنیا سے رحلت کر گیا اور امام کا دامن اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، تو اسی کی ساتھ ساتھ یہ ساری دولت اُن کی ہاتھ سے چلی گئی اور وہ ساری دلیلیں وہ تمام حجتیں صرف ایک فرقے کو حاصل ہوئیں، اور وہ امامیہ گروہ ہے یعنی اسماعیلی۔ اسلام کی مثال کو لیجئے، اسلام میں جتنی حقیقت کی ٹھوس دلیلیں ہیں، اُن کا صحیح اطلاق کہاں ہوتا ہے؟ کہیں بھی نہیں ہوتا ہے، صرف ایک جگہ ہے اور وہ اسماعیلیت ہے۔ امام کے دنیا میں ہونے کی اہمیت اور اُس کے دلائل بہت سی کتابوں میں موجود ہیں، کسی نہ کسی طرح سے اُن دلائل کو اپنانے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن وہ دلائل اپنائے نہیں جا سکتے۔ اِس کی وراثت اُن لوگوں کو حاصل ہے، جو امام کے ماننے والے ہیں، کیا ہندو مذہب میں کوئی اچھی بات نہیں ہے! اچھی بات تو ہے، لیکن عملاً نہیں ہے، کیا ہندو مذہب میں نور کی تعریف نہیں ہے! کیا ہندو مذہب میں سچائی کی تعریف نہیں ہے! مذہب والے تو کیا، جو لادین ہیں اُن میں بھی کچھ اچھی باتیں ہیں، لیکن اُن اچھی باتوں کا اطلاق وہاں پر نہیں ہوتا ہے، باتیں تو ہیں۔ اُن تمام خوبیوں کا اطلاق جو ہے وہ اسماعیلی مذہب میں ہے حضرت مولانا سلطان محمد شاہؑ کے ارشادات میں سے ایک میں یہ فرمایا گیا ہے، کہ تمہارا دین ہر ملک میں ہے [اسلام میرے مورثوں کا مذہب، صفحہ نمبر ۲۶ تا ۲۸] اب سوچنا چاہئے کہ ہمارا دین ہر ملک میں یا کہ ہر قوم

میں کس طرح ہے؟ اِس کو میں جس طرح سے سمجھتا ہوں وہ یہ، کہ علم کا پھیلاؤ اِس سیارۂ زمین پر ہر جگہ پر ہے اور ہر قوم میں ہے، اور ہر مذہب میں ہے، لیکن مذاہب میں علم کی جو اچھی اچھی باتیں ہیں وہ اچھی اچھی باتیں اُن کے لیے بے معنی ہیں عملاً نہیں ہیں یا یوں کہیں وہ باتیں وہاں پر راس نہیں آتی ہے، وہ اسماعیلیوں کی باتیں ہیں۔ اب صوفیوں کو لیجئے کتنی عمدہ، عمدہ باتیں ہیں، اُن میں مرشد کی تعریف ہے، دیدار کی تعریف ہے، تزکیۂ نفس کی تعریف ہے اور ایسی ہزاروں بلکہ لاکھوں باتیں ہیں۔ لیکن اُن باتوں کی مکمل صداقت کہاں پائی جاتی ہے؟ ایک ہی مذہب میں کسی صوفی نے کوئی دعویٰ بھی کیا ہوگا، لیکن الفاظ تو بہت ہی عمدہ مگر ممکن ہے کہ مغزِ معنی سے خالی ہو، تو اسی طرح ہر ملک میں ہر قوم میں اسماعیلی مذہب کی باتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ روایتی طور پر اُن باتوں کو اپناتے بھی ہیں، مجھے معاف کیجئے گا، میں یہ عرض کروں گا، کہ آج ہمارے اثنا عشری بھائی ہیں، ثبوتِ امامت کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہتے ہیں اور کتنی اچھی باتیں ہیں۔ ہمارے بوہرہ بھائی ہیں، علم کے معاملے میں امام کے ثبوت کے سلسلے میں کس چیز کی کمی ہے، لیکن کمی ہے عمل کی کہ عملاً امام اُن کے نزدیک اُن کے پاس نہیں ہے، لہٰذا اُن کی ساری جائیداد، عملی جائیداد اِس طرف کو لوٹ آتی ہے تو یہاں خداوندِ عالم جو فرمایا کہ کائنات کی میراث اللہ کی ہے، تو اِس سے بڑھ کر جب بندۂ مومن آخرت میں یا روحانیت میں چلا جائے گا تو یہ ساری کائنات کی میراث اور مری ہوئی روحوں کی جائیداد اور اُن کی روحانی دولت اِس پوری کائنات کی ہر چیز مومن کو حاصل ہوگی۔

اِس سلسلے میں ایک اور مثال کی ضرورت ہے، جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، کہ یہ جو قرآن میں قصّہ ہے، کہ زمانۂ نوح میں طوفان اُٹھا اور اس کی دعا کے نتیجے میں سارے لوگ ہلاک ہو گئے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ آیا اِس ہلاکت کے یہ معنی ہیں، کہ لوگ مادّی طور پر بھی جسمانی طور پر بھی ہلاک ہو گئے تھے، یا یہ کہ یہ ہلاکت روحانی طور پر تھی، کہ خدا کے رسول کی طرف سے لوگ مر گئے لیکن اپنی طرف سے نہیں مر گئے، وہ دنیا میں زندہ تھے، وہ اندر اندر سے مر گئے۔ وہ مر بھی گئے اور نئے سرے سے اُن کو ثانوی حیات دے کر، غلامی کے طور پر اور اِس معنیٰ میں جس معنی میں کوئی بادشاہ کسی ملک کو فتح کرتا ہے، تو وہ ملک اپنے آپ سے مر جاتا ہے، اُس کی حکومت مر جاتی ہے، سیاست مر جاتی ہے، کلچر مر جاتا ہے، ثقافت، مذہب، بہت ساری چیزیں مر جاتی ہیں اور پھر وہ جو بادشاہ جس نے فتح کیا ہے، اپنی رُوح میں، اپنے رنگ میں اور اپنے قانون میں اُس کو ایک نئی حیات دے کر اپنی غلامی میں اپنی ملکیت میں اِس کو لے لیتا ہے۔ اِس طرح نوح علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں کے مر جانے اور ہلاک ہو جانے کا یہ مطلب نہیں ہے، کہ وہ جسمانی طور پر مر گئے تھے، مگر نوح علیہ السلام کی دعوت سے اُس کی شریعت سے اُس کے قانون سے مر گئے تھے، اُس کے دلائل سے مر گئے تھے، لہٰذا اُن کو ایک ثانوی حیات اُس نے دیا غلامی کی سی حیات اُن کو دے کر اُن کو اپنا لیا، یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے، کہ کشتی نوح میں ہر چیز کے جوڑے کو جگہ دے، ہر چیز کے جوڑے کو، کہ اِس حکم سے کوئی جانور، کوئی درخت، کوئی انسان نہیں بچتا تھا لیکن اتنی بڑی کشتی کہاں تھی۔ دنیا

میں آج کی سائنس کے زمانے میں دیکھیں، تو آبی، ہوائی، جنگلی اور زیرِ زمین کے جانوروں کا کوئی شمار نہیں، اتنے سارے جانوروں کے جوڑوں کو انہوں نے کہاں جگہ دی؟ یہ صرف ذرّات کی بات ہے، کہ ذرّات کے جوڑوں کو لیا اور اُس صورت میں تمام کائنات بھر کی اشیاء اور مخلوقات کے جوڑوں کو لے کر نوح علیہ السلام نے ایک (personal world) آباد کی اور باقی نوح علیہ السلام کی طرف سے سب مر گئے، مر گئے اور پھر آئندہ جو نسل ہے اسی سے باقی رہی، جو نوح علیہ السلام کے پاس تھی، گندم کا ایک دانہ کیوں نہ ہو، ایک درخت کیوں نہ ہو، ایک کیڑا کیوں نہ ہو، تو روحانی طوفان کی ہلاکت میں تمام مخلوقات اور تمام جانور ہلاک ہو گئے اور کوئی نہیں بچا۔

لیکن پھر نوح علیہ السلام کی کشتی میں اور کشتیٔ روحانیت میں جتنے ذرّات تھے، اُس میں سے سب لوگ اور سارے جانور نئے سرے سے پیدا ہو گئے۔ اب یہ بات صرف نوح علیہ السلام کے زمانے کے لیے خاص نہیں ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہلِ بیتؑ یعنی امام کی تشبیہ کشتی نوح سے دی ہے [مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِيْ فِيْكُمْ كَسَفِيْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجَا وَ مَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرَقَ] اور روحانیت کا طوفان ہر امام کے زمانے میں اُٹھتا ہے اور اِس میں لوگ اسی طرح ہلاک ہو جاتے ہیں، جس طرح زمانۂ نوح میں ہلاک ہو گئے تھے۔ پھر لوگوں کی دو حیثیتیں ہو جاتی ہیں، غلامی اور ملکیت کے طور پر اور اصل سلطنت کے طور پر، پھر اِس واقعہ کو ہم یا تو روحانیت میں دیکھ سکتے ہیں یا قیامت میں، یہ ہے خدا کے اِس ارشاد کا مطلب جو فرمایا کہ کائنات کی میراث رو راثت اللہ کو پہنچتی ہے، یہ بحث میں نے کیوں چھیڑی ہے؟ اِس لیے چھیڑی ہے، کہ وراثت کا سوال اُس وقت پیدا ہوتا ہے، جبکہ اصل مالک مر جاتا ہے۔ اگر یہ کائنات اور اِس کی مخلوق بار بار نہیں مرتی ہے، تو یہ کائنات کی جائیداد خدا کو کیوں پہنچتی ہے، اور کیوں کر پہنچ سکتی ہے؟ لوگ اگر نہیں مرتے ہیں تو اِن کی روحانی اور جسمانی جائیداد خدا کی ملکیت کیوں کر بن سکتی ہے۔ ابھی آپ کو یہ تصور معلوم ہوا کہ قرآن میں جہاں کہیں یہ ارشاد ہے، کہ اللہ کی ہے کائنات کی میراث، آسمانوں کی میراث یا زمین کی میراث، تو اِس سے یہ مقصود ہے کہ لوگ روحانی طور پر بار بار ہلاک ہو جاتے ہیں آپ اگر سوال کرنا چاہیں یہ کتنی بار اور کس طرح ہلاک ہو جاتے ہیں؟ تو میں آپ سے عرض کروں کہ اوّل تو امام کے نزدیک امام کی روحانیت کے طوفان میں روحانیت کے بہت سے پہلو ہیں، اُن میں سے ایک خاص پہلو طوفان ہے، طوفان نوحؑ، اِس طوفان میں سب دنیا والے ہلاک ہو جاتے ہیں اور پھر اُن کی ساری جائیداد اور ان کی مری ہوئی روح جو ہے، امام کی ملکیت قرار پاتی ہے۔ اِس کے علاوہ یہیں تک محدود نہیں ہے اگر کوئی مومن طریق روحانیت میں آگے بڑھے اور کوئی بڑا تجربہ کرے اور اُس کی ایک پرسنل دنیا بنے، عالم شخصی بن جائے تو اُس وقت یہ محسوس کرے گا کہ دنیا کس طرح مر گئی، اور سارے لوگ اُس کی ذاتی دنیا میں، اُس کے ذکر کی کشتی میں کس طرح نجات پا گئے، تو اُس وقت اِس کا مشاہدہ ہو سکتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ آج کی گفتگو کو میں ختم کرتا ہوں، اور اگر کسی صاحب کا کوئی سوال ہے تو پوچھا جا سکتا ہے۔

سوال: [ڈاکٹر صاحب، بحرالعلوم] کہ اُس کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہے، تبدیلی جو ہے، وہ عالمِ خلق میں ہے، جی ہاں۔ دوسری لحاظ سے کہ جب مومن کی روح روحانی عالم میں سفر کرتے کرتے جب اُس کے علم کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے، تو واپس اِس دنیا میں علم کے حصول کی خاطر روح آتی ہے، جی۔ اب اِن ہی تجربوں کو واپس لیکر جاتی ہے، حالانکہ اُس کا جو پرانا تجربہ تھا وہاں وہ محفوظ ہے، اب یہ تجربہ ساتھ لے جا کر روحانی دنیا میں جائے، اِس میں وہ کس طرح (adjust) کرنے کی بات ہوئی، صاحب اس سلسلے میں کچھ ارشاد [فرمائیں]، اس صورت میں تبدیلی سمجھیں یا تبدیلی نہ سمجھیں؟

جواب: جیسا کہ بہت ہی عمدہ اور عمیق یعنی گہرا سوال ہے اور ایسا سوال کوئی نہیں کرسکتا ہے، اوّل تو عالمِ امر خود ایک ہی بلند ترین حقیقت ہے، یہ ہے کہ عالمِ امر میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی ہے، ایک طرح سے وہ صحیح ہے، لیکن علم کا جو تجزیہ کرنا ہوتا ہے، وہ ختم ہوتا ہے اور ختم ہونے کے بعد جدّت کا کوئی مزہ باقی نہیں رہتا اور علم کا جس طرح پھیلاؤ اِس کائنات کے برابر ہے، سو عرصۂ دراز تک اِس کائنات کا تجزیہ کرتے کرتے، تو پھر تجزیہ ختم ہو جاتا ہے اور ختم ہونے کے ساتھ علمی حرکت ایک طرح سے رُک جاتی ہے۔ پھر اِس کی جدّت کے لیے، اِس کی تجدّید کے لیے وہ رُوح جو عالمِ امر میں ہے، وہ انا جو انائے علوی کہلاتی ہے، اپنا ایک (shadow) یا کہ سایہ اس عالمِ خلق میں بھیجتی ہے۔ اِس لیے پیر ناصر خسروؒ نے اپنے ارشاد میں فرمایا ہے "روح بود ولیکن بے علم" قرآنی آیت کا بھی یہ ارشارہ ہے، ہم نے اِس کو کہیں بیان کیا ہے، اور اِس کی ایک اور دلیل سورۂ ھَلۡ اَتٰی میں ملتی ہے کہ "هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ یَکُنۡ شَیۡئًا مَّذۡکُوۡرًا" (۷۶:۱) کیا انسان پر وقتِ ناگزرندہ سے ایک ایسا وقت آیا ہے جس میں کہ انسان کوئی شَیۡئًا مَّذۡکُوۡر نہیں تھا۔ اِس سے کیا آیا ہے انسان پر اٹل وقت سے ایک ایسا وقت جس میں کہ انسان کوئی قابلِ ذکر شے نہیں تھا؟ اِس میں ذرا غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان پر ایک وقت پہلے آیا تھا اور اب وہ آنا چاہتا ہے لیکن ابھی نہیں آیا ہے، اِس کی منطق ایسی بنتی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بیان ہے کہ شَیۡئًا مَّذۡکُوۡر نہ ہونے کا کیا مطلب؟ کہ جب علم کا فعل ختم ہوتا ہے، تو اسی کے ساتھ ساتھ نام بھی ختم ہو جاتا ہے، جب ماسٹر سے ماسٹری چلی جاتی ہے جب ٹیلر سے ٹیلری چلی جاتی ہے، تو حقیقت میں اُس کا کوئی نام نہیں رہتا ہے، بے نام لیکن وہ نہیں ہونا چاہئے، نام ایسا ہونا چاہئے اُس نام کے مطابق فعل بھی ہو۔ جب تجزیہ کے لیے علم باقی نہیں رہتا ہے، تجزیہ کے لئے کوئی گوشہ باقی نہیں رہتا ہے کہ اُس کا تجزیہ کرے، تو پھر حقیقت میں ایک ایسا بوڑھا ہوتا ہے کہ جس کو قرآن نے کہا کہ "اَرۡذَلِ الۡعُمُرِ" (۱۶:۷۰، ۲۲:۵) عمر کا رذیل وقت جیسے بوڑھا ہوتا ہے، تو کچھ بھی کام نہیں کرسکتا ہے وہ پڑے پڑے رہتا ہے، اور کھانے کے لیے اُس کے دانت بھی نہیں رہتے ہیں تو پھر ایسے بوڑھے کا کیا تو اسی طرح یہ اُس اعتبار سے ہونا چاہئے، کہ یعنی جو سایہ یہاں سے جاتا ہے اُس کی نسبت سے ہونا چاہیے کیونکہ یہ سایہ جو انائے سفلی ہے، اِس کو جو انائے علوی سے قربت ہوتی ہے، اُسی کی بات ہے، اور پھر اِس نے اپنی زندگی بنانے کے لیے

کچھ تو علم کو حاصل کیا تھا کچھ تو سوالات کمائے تھے،تو اب یہ علم ہے نا اِس جیسے وہاں نئے سرے سے تجزیہ کرے گا اور جو سوالات ہیں وہاں نیش چند ہو کر اُن کے لیے جوابات مہیا کرے گا اور پھر اِس کے لیے طرح طرح کی قوتیں عطا کی جائیں گی تا کہ یہ کائنات کا تجزیہ کرے۔

عالم ،علم، عالم تو عالم کا کیا مطلب؟ عالم البتہ اسمِ آلہ ہے علم کا، اور علم اسی عالَم میں ہے اِس لیے اِس عالم کو خدا کی کتاب کہتے ہیں، کتابِ کائنات کہتے ہیں یا صفحۂ کائنات کہتے ہیں، تو علم اسی عالم میں ہے اور جیسے بہشت بھی بہشت کی منزلیں بھی طے ہوتی چلی جاتی ہیں، تو پھر سفر گولائی میں ہے اور حرکت کے بغیر کوئی زندگی نہیں، حرکت یا تو عقلی اور علمی ہے یا روحانی ہے یا مادّی ہے جسمانی، جس مادّہ کی باطنی حرکت نہیں ہے، تو وہ مثلاً مردہ ہے، مثلاً نباتات کی حرکت شروع ہو جاتی ہے جو نشوونمائی اور بڑھنے کی صورت میں ہے ہرا بھرا ہو جانے کی صورت میں ہے یہ تو ایک طرح سے زندہ ہے۔ حیوان کو حرکت ہے وہ زندہ ہے اور انسان کو جسمانی حیوانی کے علاوہ عقلی بھی حرکت ہے، اِس واسطے انسان کی جو زندگی ہے اُس سے بڑھ کر ہے اور اگر یہ حرکت نہ ہو تو اِس کو موت کہا جائے گا۔ فکری حرکت، علمی حرکت، تجزیہ کی حرکت اور سوچنے کی حرکت وغیرہ تو پھر حرکت کے لیے وسیلہ کیا ہے؟ سامنے کوئی چیز ہونی چاہیے جس طرح غذا کے طور پر، زندہ رہنے کے لیے غذا چاہیئے اور علمی طور پر زندہ رہنے کے لیے تجزیہ کرنے کے لیے کوئی چیز چاہیئے، کوئی فکر چاہیے، کوئی سوال چاہیئے، کوئی غور چاہیئے، کوئی مضمون چاہیئے اور ’’ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ ‘‘(۸:۱۳) ہمارے نزدیک ہر چیز لاانتہا ہے لیکن خدا کے نزدیک ہر چیز مُنتہا ہو جاتی ہے’’ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ ‘‘ صحیح ہے، لیکن اسی کی دُہرائی ہو جائے تو لاانتہائی بن جاتی ہے جس طرح دن محدود ہے رات محدود ہے، اِن دُو محدود چیزوں سے لامحدودیت لاانتہائی بن جاتی ہے اس طرح علم کا ایک بار تجزیہ، دوسری بار تجزیہ، تیسری بار تجزیہ کرنے سے لاانتہائی بنتی ہے۔ لیکن ایک بارکی بات ہے کہ دن ختم ہو جاتا ہے رات بھی ختم ہو جاتی ہے سال بھی ختم ہو جاتا ہے، لیکن اسکو ایک سلسلہ بنایا جائے تو کوئی چیز ختم نہیں ہوتی ہے۔ مطلب لاانتہائی جو بنتی ہے وہ انتہا سے بنتی ہے، تو لہٰذا سفر چونکہ گول ہے، وہاں سے ایک ’’كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ‘‘(۲۹:۵۵) یہ آپ ہی نے فرمایا تھا آپ نے اِس کی تاویل کی تھی تو ایک شان ہو گئی، تو پھر دوسری شان کا آغاز ہونا چاہیئے تو مزہ اسی میں ہے۔ ایک نئی دنیا دیکھنے کے لیے آئیں تب تک یہ دنیا بدل جائے گی اور ایک بہار چلی جائے گی تو پھر دوسری بہار چلی آئے گی، تو ہم دیکھتے ہیں خدا کی بادشاہی میں جِدّت ہی جِدّت ہے اور ہر چیز بار بار آتی جاتی ہے۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: شہزادی ایش خان　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　پُروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ بلد

کیسٹ نمبر: Q-45　　تاریخ: ۲۶ر جنوری ر ۱۹۸۴ء، کراچی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

یا علی مدد، عزیزانِ من! آج سورۂ بلد کے بارے میں کچھ ترجمہ اور کچھ تاویل عرض کریں گے۔ اِس سورہ کی ایک بڑی اہمیت یہ ہے کہ اِس میں بلد کی تعریف کی گئی ہے، اور بلد شہر کو کہتے ہیں، اور ظاہر میں یہ مکّہ شریف ہے اور باطن میں یہ اساس ہے اور اِس سورہ کی اہمیت اِس لئے بھی ہے کہ اِس میں چار عظیم حدود کا ذکر آتا ہے، وہ آپ کو بتائیں گے۔

''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝ لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ'' (۹۰:۱) خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے، میں قسم کھاتا ہوں اِس شہر کی۔ ظاہری طور پر دیکھا جائے، تو اللہ تعالیٰ شہر مکّہ کی قسم کھاتا ہے اور باطنی طور پر دیکھا جائے، تو خداوندِ عالم چار عظیم حدود میں سے اساس کی قسم کھاتا ہے، اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ پروردگارِ عالم ایسے موقع پر قسم یاد فرماتا ہے جبکہ وہاں کسی بڑے راز کی بات بتانا ہو، اور یہاں پر خداوند کیا راز بتانا چاہتا ہے، وہ اِس دوسری آیت میں آتا ہے اور وہ یہ ہے: ''وَاَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِ'' (۹۰:۲) کہ اے محمد رسول ﷺ آپ اِس شہر میں داخل ہونے والے ہیں، اور آپ جانتے ہیں کہ جہاں کوئی خاص تاویل ہوتی ہے، تو اُس کا ایک پیش منظر ہوتا ہے اور ایک پس منظر ہوتا ہے یعنی ایک ظاہری پہلو ہوتا ہے اور ایک باطنی پہلو۔ جو ظاہری پہلو ہوتا ہے اُسے تنزیل کہتے ہیں اور جو باطنی پہلو ہوتا ہے اُسے تاویل کہتے ہیں تو چنانچہ خدائے جلیل و جبّار نے یہاں جو قسم کھائی ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تبارک و تعالیٰ ایک بہت بڑے بھید کو ظاہر کرنا چاہتا ہے اور وہ تاویلی بھید یہ ہے کہ آنحضرتؐ سے فرماتا ہے کہ آپ اِس شہر میں داخل ہونے والے ہیں۔ ظاہر میں یہ پیشگوئی ہے کہ آنحضرتؐ جیسے مکّہ سے مدینہ چلے گئے تھے ہجرت کرکے، مہاجر بن کے، پھر وہاں سے واپس مکّہ کو لینے کی، فتح کرنے کی پیشگوئی کی جارہی ہے۔ یہ ظاہری پہلو ہے، مگر تاویلی پہلو یہ ہے کہ خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ اے رسولؐ جب آپ اِس جسم کو چھوڑ دیں گے، تو اُس وقت آپ اِس شہر میں یعنی اساس میں داخل ہو جائیں گے۔ جیسا کہ آنحضرتؐ کا ایک ارشاد ہے کہ: ''بَيۡنَ قَبۡرِيۡ وَ مِنۡبَرِيۡ رَوۡضَةٌ مِنۡ رِيَاضِ الۡجَنَّةِ'' میری قبر اور منبر کے درمیان بہشت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔ یہاں پر قبر سے اساس یعنی علیؑ مراد ہیں اور منبر سے قائم القیامت مراد ہیں، تو اِس حدیث

کی روشنی میں بھی ہم کو یہ پتہ چلا کہ ایک اعتبار سے مولا علیؑ جو اساس ہیں، شہر ہیں جس میں رسولؐ داخل ہونے والے تھے، دوسرے لحاظ سے مولا علیؑ، آنحضرتؐ کی قبر ہیں، زندہ قبر اور جس میں ایک طرح سے حضورِ اکرم ﷺ کا نور مدفون ہو جاتا ہے، تو تاویل کے لئے بہت سی مثالیں ہوا کرتی ہیں، اُن بہت سی مثالوں میں سے یہاں اِس آیت میں مولا علیؑ کی شخصیت کی تشبیہ شہر سے دی گئی ہے اور اُس حدیث میں مولا کی شخصیت کی تشبیہ آنحضرتؐ کی قبر سے دی گئی ہے اور مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے لیکن اِس قبر کا مطلب قبرِ خاکی نہیں بلکہ زندہ قبر، جس میں کوئی ہستی، کوئی رُوح زندہ رہ سکتی ہے، ایسی قبر۔

اُس کے بعد اور قسم یاد فرماتا ہے: ''وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ'' (۹۰:۳) اور باپ کی قسم اور اولاد کی قسم۔ دیکھئے کہ دانشمند کے لئے یہ بات ظاہر ہے کہ خداوندِ عالم ہر بُرے بھلے باپ کی اور اولاد کی قسم نہیں کھا سکتا ہے، قسم کھانے کے لئے کوئی مقدّس سے مقدّس شئ چاہئے۔ یہ اُصول آپ جانتے ہیں کہ جب انسان قسم کھاتا ہے، تو اپنے سے برتر چیزوں کی قسم کھاتا ہے لیکن جب خدا قسم کھاتا ہے، تو اُس سے کوئی برتر شئ نہیں ہے، لہٰذا اپنے سے قریب تر چیزوں کی قسم یاد فرماتا ہے۔ لہٰذا تاویل کے جاننے کے اعتبار سے یہ اُصول ہمارے لئے بہت ہی ممدّ و معاوِن ثابت ہو سکتا ہے، کہ ہم جانیں کہ قرآن میں خداوند نے جن جن عام چیزوں کی قسم کھائی ہے وہ ظاہر میں عام ہیں مگر باطن میں اور تاویل کی روشنی میں وہ عام چیزیں نہیں ہیں، وہ کچھ مقدّس اور خدا سے قریب چیزیں ہیں، تو اِس لئے یہاں پر خداوندِ عالم نے جو باپ کی اور بیٹے کی یا اولاد کی جو قسم کھائی ہے، تو یہ کچھ عام بات نہیں ہو سکتی ہے بلکہ خاص بات ہے اور وہ خاص بات یہ ہے کہ والد سے عقلِ کُل مراد ہے، ولد یعنی اولاد سے نفسِ کُل مراد ہے۔ اِس لئے کہ سب سے پہلا باپ عقلِ کُلی ہے اور سب سے پہلی اولاد نفسِ کُلی ہے اور باپ اِس معنیٰ میں کہ ایک طرح سے عقلِ کُلی نے نفسِ کُلی کو جنم دیا اور اولاد اِس معنیٰ میں کہ نفسِ کُلی، عقلِ کُلی سے پیدا ہوئی۔ اِسی کے ساتھ چار عظیم حدود کا ذکر آیا، سب سے پہلے پیغمبر کا ذکر آیا جس سے فرمایا جاتا ہے کہ آپ اِس شہرِ مکّہ میں یعنی اساس میں داخل ہونے والے ہیں، پھر اساس کی قسم کھائی، آپ کی تشبیہ شہرِ مکّہ سے دیتے ہوئے، پھر عقلِ کُلی کا ذکر ہوا والد قرار دیتے ہوئے، پھر نفسِ کُلی کا ذکر ہوا اولاد قرار دیتے ہوئے، اِسی کے ساتھ چار عظیم حدود کا ذکر ہوا۔

اِس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ''لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ'' (۹۰:۴) خدا قانونِ فطرت کو بیان کرتا ہے اور اِس کے دو پہلو ہیں، البتہ تحقیق ہم نے انسان کو مشقّت میں پیدا کیا۔ اِس مشقّت کی نسبت خدا سے نہیں ہے، انسان سے ہے اور اللہ کے یوں فرمانے کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ انسان جو پیدا کیا گیا اِس کے سامنے ہر طرف سے مشقّت ہی مشقّت ہے، ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہونے کے بعد سے لے کر موت تک، یہ مشقّت ہی مشقّت ہے اور دوسرا پہلو جو تاویلی ہے وہ یہ ہے کہ خدا یہ کہنا چاہتا ہے کہ رُوحانی تخلیق اُس وقت ہوتی ہے، رُوحانی تکمیل، (perfection) اُس وقت ہوتی ہے جبکہ انسان محنت اور ریاضت سے کام لیتا ہے تو یہ مومنین کے لئے ایک عمدہ اشارہ ہے کہ خدا یہ بتانا چاہتا ہے اشارۃً

دوسرے سب عام انسانوں سے چھپا کر، مخفی انداز سے یہ بتانا چاہتا ہے، کہ مومنین کو اپنی رُوحانی ترقّی کے سلسلے میں بہت زیادہ محنت سے کام لینا چاہئے کیونکہ یہ قانونِ فطرت ہے (law of nature) ہے کہ تکمیل، رُوحانیت کی تکمیل محنت سے ہوتی ہے، مشقّت سے ہوتی ہے۔ اِس کے بغیر کوئی پیغمبر، کوئی امام، کوئی مومن رُوحانی طور پر ترقّی نہیں کرسکتا ہے اور ہمیں اِس میں دھوکا ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء کی جو رُوحانی ترقّی ہے وہ (automatic) ہے، ایسی بات نہیں ہے۔ شروع میں ایک ہی قانون ہے، بہت کچھ مشقّت اُٹھانی پڑتی ہے، اور بیشک آگے چل کر یہ عبادت اور ہر چیز خودکار طریقے سے آگے بڑھتی ہے، تو خداوندِ عالم نے یہاں یہ اُصول بتایا کہ انسان کی تکمیل اور رُوحانی ترقّی اِس بات میں ہے کہ انسان بہت زیادہ اِس سلسلے میں محنت اُٹھائے۔

''اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ''(۹۰:۵) کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اُس پر کوئی قادر نہیں ہے، اُس پر کوئی قدرت نہیں رکھتا ہے۔ کیا انسان کا یہ گمان ہے یا یہ کہ کیا انسان کا یہ گمان ہے، کہ اُس کے لئے تقدیر نہیں ہوگی؟ تقدیر سے مراد مقدار، اندازہ یعنی کتنی عبادت چاہئے؟ کس معیار کی مشقت چاہئے؟ اِس میں کتنا (force) ڈالنا چاہئے؟ اِس کا ایک اندازہ ہے، اِس کا ایک معیار ہے، تو کیا انسان یہ سوچتا ہے کہ اُس کے لئے کوئی معیار نہ ہو اور اُس کی عبادت اور ریاضت کی کوئی مقدار نہ ہو؟ ضرور ہے۔

''یَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا''(۹۰:۶) اور کہتا ہے کہ میں نے اتنا وافر مال خرچ کر ڈالا۔ اِس مال سے ظاہری مال بھی مراد ہوسکتا ہے، اِس مال سے کوئی شخص اپنی مذہبی مشقّت، عبادت، ریاضت مراد لے سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجموعی طور پر انسان جو کچھ کرتا ہے رُوحانی ترقّی کے سلسلے میں، اُس کو کافی سمجھتا ہے تو یہ اُس کے لئے ایک فریب ہے، وہ فریب کھاتا ہے، اور ہر مومن یہ سوچتا ہے، کہتا ہے کہ میرا ہر کام ٹھیک ہے، میں باقاعدہ عبادت کرتا ہوں، میں زکات کا پابند ہوں اور اِس قسم کی بہت سی چیزوں کو شمار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ معلوم نہیں کیوں میری ترقّی نہیں ہے۔ بہت سے مومنین ایسا سوچتے ہیں تو یہ اُن کو معلوم ہونا چاہئے، کہ یہ اُن کے کہنے کے مطابق ہے، یہ اُن کا گمان ہے، لیکن خدا کے معیار کے مطابق یہ ساری چیزیں کم ہیں اور خدا کے معیار کے مطابق نہیں ہے، اِس لئے رُوحانی ترقّی نہیں ہوتی ہے ایک مومن کی۔

''اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗ اَحَدٌ''(۹۰:۷) کیا وہ یہ گمان کرتا ہے کہ کوئی اُسے نہیں دیکھتا ہے؟ یہ اشارہ خدا کی طرف ہے، کیا اُس کو گمان ہے کہ خدا اُسے نہیں دیکھتا ہے؟ اِس کا مفہوم یوں ہے، اِس کی وضاحت یہ ہے، کہ اگر مومن کا ہر کام صحیح ہوتا تو خدا جو دیکھنے والا ہے اُس کو چاہئے تھا کہ اِس کو آگے بڑھاتا، اِس پر کوئی دروازہ کھولتا، اِس کو کوئی روشنی دکھاتا، ایسی بات نہیں ہے۔ خدا دیکھتا ہے، خدا ہر وقت دیکھتا ہے اور جو کچھ مومن کرتا ہے وہ خدا کی نظر میں ہے۔ ایسا نہیں کہ اُس سے بے انصافی ہو رہی ہے۔

''اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَيۡنَيۡنِ ''(۹۰:۸) کیا ہم نے اُس کی دو آنکھیں نہیں بنائی ہیں؟ اِس کا ایک مطلب یہ ہے کہ جس خدا نے انسان میں دو آنکھیں بنائی ہیں، ظاہر ہے کہ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے، جو دیکھنے کے ذرائع کو مہیّا کر دیتا ہے وہ دیکھتا ہے اور اِس کا دوسرا مطلب یہ ہے، کہ اگر انسان میں دو آنکھیں ہیں تو یہ دو آنکھیں کیوں ہیں؟ اگر ایک آنکھ ہوتی تو اُس سے بھی دیکھا جاتا، آنکھوں کے دو ہونے میں کیا اشارہ ہے؟ اِس کا اشارہ یقیناً یہ ہے کہ دیکھنا دو طرح سے ہے، ظاہر میں اور باطن میں، اِس کے لئے انسان کو دو آنکھیں عطا کر دی گئیں ہیں۔

''وَلِسَانًا وَّشَفَتَيۡنِ ''(۹۰:۹) اور اُس کو ایک زبان دی گئی ہے اور دو ہونٹ دیئے گئے ہیں جو بولنے کے آلے ہیں۔ اِس میں بھی وہی بات ہے کہ زبان اگرچہ ایک ہے لیکن اِس کے بھی دو حصّے ہیں، تو زبان ایک طرح سے دیکھا جائے تو ایک ہے اور پھر دوسرے اعتبار سے دیکھا جائے تو دو ہیں، کیونکہ اِس میں دوئی کی علامت پائی جاتی ہے کہ اِس کے درمیان ایک لکیر ہے جس سے زبان ایک ہونے کے باوجود دو حصّوں میں بٹ جاتی ہے اور ہونٹ دو ہیں، تو بولنے کے یہ آلے میں، جب دوئی ہے تو ہمیں سمجھنا چاہئے کہ بولنا بھی دو طرح سے ہے، ظاہر میں اور باطن میں، ہمیں باور کرنا چاہئے کہ بولنا جو ہے وہ دو طرح سے ہے، ظاہر میں اور باطن میں۔

''وَهَدَيۡنَاهُ النَّجۡدَيۡنِ ''(۹۰:۱۰) اور ہم نے اُس کو خیر و شر کے دونوں رستے بتلا دیئے۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو خیر اور شر کے دونوں رستے دکھا دیئے ہیں۔ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ خیر کے رستے کو دکھا دیا تو بات سمجھ میں آ گئی لیکن شر کے رستے کے دکھانے میں کیا حکمت ہے؟ اگر خدا خیر کے رستے کو دکھا کر شر کے رستے کو نہیں دکھاتا تو پھر یہ انصاف نہیں ہوتا۔ شر کے رستے کو بھی شر کے طور پر دکھانا چاہئے تا کہ انسان شر کے نتائج کو سمجھ پائے اور کئی طرح سے ہم شر کے نتائج کو دُنیا میں جانتے ہیں، اپنی ذات کے وسیلے سے جانتے ہیں اور دوسروں کے ذریعے سے بھی جانتے ہیں، تو خداوندِ عالم نے دونوں رستے دکھائے۔ اِس میں یہ اشارہ ملتا ہے اور بہت ہی عمدہ اشارہ ہے، کہ یہ دو رستے خدا نے ذاتی طور پر نہیں دکھائے، اِس کے لئے وسیلے مقرر کئے۔ ہم سب سے پہلے شر کی بات کریں گے کہ شر کا وسیلہ شیطان کو قرار دیا اور خیر کا وسیلہ پیغمبر اور امام کو قرار دیا، اور یہاں پر بہت عمدہ (logic) بنتی ہے یہ کہ جس طرح شیطان جو مضّل ہے، مضّل کا مطلب گمراہ کُن اور (misguide) کرنے والا، وہ دُنیا میں ہمیشہ ہے، بڑی مضبوطی کے ساتھ ہے، بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ ہے اور بہت دُور سے اثر انداز ہو سکتا ہے، انسان کے دل تک اُس کی رسائی ہے اور اپنے (message) کو پہنچا سکتا ہے، بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اب یہ قابلِ غور بات ہے کہ اگر خدا نے شیطان کو اتنا کچھ (power) دینے کے بعد خیر کے ذریعے کو درمیان سے اُٹھا لیا ہوتا یعنی پیغمبر اور امام کو، تو بیچارہ انسان کیا کرتا اور قیامت کے دن جو بڑی باریکی کے ساتھ عدالت قائم ہونے والی ہے خدا کی، تو اُس وقت انسانوں کے لئے یہ بہانا ہوتا کہ پروردگار تُو نے دُنیا میں خیر و شر کے جو دو

رستے بنائے تھے اُن میں سے، شر کے لئے تُو نے سب کچھ کیا تھا، اور خیر کا جو ذریعہ تھا اُس کو تُو نے درمیان سے اُٹھالیا، ہم کیا کر سکتے تھے، ہم مجبور ہیں، تو پھر اُس وقت خدا کے لئے کیا دلیل ہو گی؟ یہ مفروضہ صحیح نہیں ہے، یہ انہونی بات ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کی حجّت خدا پر قائم ہو جائے گی۔

اِس سے پتہ چلتا ہے کہ شر کے ذریعے میں جتنی مضبوطی ہے، جس قدر رسائی ہے اور جس آسانی سے شیطان لوگوں کو گمراہ کر سکتا ہے اُس کے مقابلے میں خیر کے وسیلے کو بھی اتنا مضبوط ہونا چاہئے کہ وہ بھی اپنے (message) اُن کو پہنچائے جن کو پہنچانا چاہئے، تو (by-force) نہ تو شیطان کچھ کر سکتا ہے اور نہ ہادیٔ برحق یعنی جبر سے، مجبوری سے بات نہیں ہونی چاہئے۔ ہونا چاہئے اِس طرح کہ جو ایسے ہوں کہ اُن کو شیطان کا (message) پہنچنا چاہئے، تو اُن کو شیطان کا (message) پہنچ جاتا ہے اور جن کو رحمٰن کا (message) پہنچنا چاہئے اور وہ اِس قابل ہیں، اُن کا دل ایسا ہے تو اُن کو رحمٰن کا (message) توفیق کے نام سے، ہدایت کے نام سے ظاہر میں اور باطن میں، تو یہ خیر کی طرف سے یہ توفیق یا یہ ہدایت یا یہ (message) آنا چاہئے اور بالکل یہی بات صحیح ہے۔ خداوندِ عالم نے قرآن کی کئی آیات میں ترازو کا ذکر کیا ہے اور اِس ترازو سے بعض مفسّرین یا مترجمین صرف یہی سمجھتے ہیں کہ دُنیا کے ترازو کو سیدھی رکھی جائے بات ختم ہو گئی، لیکن اِس کی تاویل کو وہ نہیں سمجھتے ہیں۔ دُنیا کی ترازو کو سیدھی نہ رکھی جائے تو ایسا دکاندار اور ایسا تولنے والا ایک نہ ایک دن رُسوا ہی ہو جائے گا اور لوگوں کی نظروں سے کہاں بچ کر خود کو سلامت رکھ سکتا ہے، یہ بات آسان ہے۔ لیکن خدا کا اصل جو مقصد ہے [یہ کہ] وہ حقائق کو، حقیقتوں کو، اُصولات کو، نظریات کو تولنے کے لئے تاکید فرماتا ہے اور یہ تولنا یہ ہے کہ جب انسان کو ایک متوازن اختیار دیا گیا ہے، تو اِس میں (balance) برابر ہونا چاہئے کہ شیطان کی شرارت اور بُرائی یا بُرے خیالات جس طرح اور جس آسانی کے ساتھ انسان کو آتے رہتے ہیں تو اِسی طرح دوسری طرف سے امام کے توسّط سے رحمٰن کی توفیقات اور اُس کی ہدایت کو بھی آنا چاہئے اور جس طرح شیطان دو قسم کا ہوتا ہے، جنّی ہوتا ہے، انسی ہوتا ہے یعنی شیاطین جنّات میں سے بھی ہوتے ہیں، انسانوں میں سے بھی ہوتے ہیں اِسی طرح جو ہادیٔ برحق ہے اُس میں بھی دُہرا (power) ہونا چاہئے کہ لطیف جسم میں ہوں اور کثیف جسم میں ہوں۔ جنّ سے مراد لطیف جسم ہے، تو بالکل یہی بات ہے تو امام کے ساتھ لطیف مخلوق کو آپ فرشتہ کہہ سکتے ہیں، فرشتے کہہ سکتے ہیں، اور امام کے ظاہری یا باطنی حدود کہہ سکتے ہیں، تو امام کی رَسائی جس طرح ظاہری ہے اُس طرح باطنی ہے اور دوسری طرف سے شیطان کی رَسائی نہ صرف باطنی ہے بلکہ ظاہری بھی ہے تو دو قسم کی رسائی ہے، اور یہ وسیلۂ خیر اور وسیلۂ شر ایک دوسرے کے مدِمقابل ہیں اور پھر اُصولاً اِن کی ایک دوسرے سے دشمنی ہونی چاہئے جس طرح آگ اور پانی کے آپس میں دشمنی ہوتی ہے اور ہاں! دشمنی ہے کہ ہادیٔ برحق کا جو دشمن ہے وہی شیطان ہے اور شیطان کے ساتھ جو جنگ کرتا ہے وہی خلیفۂ خدا ہے، اور یہ جنگ زمانۂ آدم سے شروع ہو گئی ہے اور قیامت تک یہ جاری رہے گی۔

مولائے رومؒ نے اپنی مثنوی جیسی مشہور کتاب میں اِس کا تذکرہ کیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ دو لشکر ہیں آمنے سامنے جو آپس میں لڑتے ہیں اور ایک سفید جھنڈا ہے اور ایک سیاہ جھنڈا ہے تو مولائے رومؒ (symbolize) کرتا ہے کہ جو شیطان کا جھنڈا ہے وہ کالا ہے اور جو رحمٰن کا جھنڈا ہے وہ سفید ہے لیکن جنگ جو ہے وہ جاری ہے تو قرآن کی کئی آیات میں بھی اِس جنگ کا ذکر ہے اور خداوندِ عالم ایک آیت میں ارشاد فرماتا ہے اُس کا مفہوم ہے کہ میں اپنے رسولوں کے ساتھ غالب آؤں گا، پھر دوسری آیت میں کہتا ہے کہ شیطان کا جو (power) ہے وہ نسبتاً کمزور ہے، تو یہ خدا کی رحمت ہے کہ شیطان آخر کار شکست کھانے والا ہے، رحمٰن کا جو نمائندہ ہے، جو خلیفہ ہے وہ غالب آنے والا ہے، تو یہ انفرادی طور پر بھی غالب آنا ہے اور اجتماعی طور پر بھی غالب آنا ہے اور اجتماعی طور سے مراد جب سے دین کا آغاز ہوا اُس وقت سے لے کر ایک خاص زمانے میں دین کا غلبہ ہوگا اور پھر انفرادی طور سے مراد یہ ہے کہ ایک مومن اپنی زندگی میں ریاضت کرتا ہے، جدوجہد کرتا ہے تو یہ مومن ہادیٔ برحق کی رہنمائی اور اُس کی مدد سے غالب آئے گا۔

''فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ''(۹۰:۱۱) میں ارشاد ہے کہ سو وہ شخص دین کی گھاٹی میں سے ہو کر نہ نکلا۔ دین کی گھاٹی میں سے ہو کر نکلنے کا مطلب یہ ہے کہ جسمانی حالت میں اور رُوحانی حالت میں کچھ سامنے تکالیف ہیں، اُن تکالیف سے آگے گزر جانے کے بعد کچھ ملتا ہے، تو اُن تکالیف اور آزمائشوں کی تشبیہہ گھاٹیوں سے دی جاتی ہیں، کہ ریاضت کی اور رُوحانیت کی گھاٹیاں ہیں، اُن گھاٹیوں سے جب تک مومن آگے نہیں گزرتا ہے، تو اُس کو کامیابی نہیں ہوتی ہے۔

''وَمَآ اَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ''(۹۰:۱۲) تو وہ گھاٹی کیا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ گھاٹی سے کیا مراد ہے؟ ''فَكُّ رَقَبَةٍ ''(۹۰:۱۳) ایک گردن کو چھڑانا ہے۔ گردن کو چھڑانا محاورہ ہے زمانۂ ظہورِ اسلام کے مطابق کسی غلام کو آزاد کر دینا، اِس کو کہتے ہیں گردن کو چھڑانا، ظاہر میں یہ بات ہے، اور باطن میں یہ بات ہے کہ مومن عام حالت میں ایک غلام کی طرح ہے، نادانی میں، جہالت میں، تقلید میں، تو سب سے پہلے اپنی ہستی کو، اپنی ذات کو غلامی سے آزاد کر لینا چاہیئے۔ اِس سلسلے میں آپ کو ایک بہت عالیشان ارشاد ملے گا، حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کا جو میرے خیال میں افریقہ کے کسی ملک میں، دارالسلام میں یا کہیں مولا نے ارشاد فرمایا ہے اور اُس میں بڑی روشنی ڈالی گئی ہے کہ مومن کی ہستی کیا ہے اور ہم کیسے غلام ہیں اور کب تک یہ غلامی رہے گی، وغیرہ۔ یہاں پر ظاہر میں کسی بھی غلام کو آزاد کرنے کا ذکر ہے اور باطن میں سب سے پہلے مومن جو غلام ہے اُس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔

''اَوْ اِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ''(۹۰:۱۴) یہاں کھانا کھلانا ایسے دن میں جس میں کہ قحط ہوتا ہے۔ ظاہر میں اِس کا مطلب یوں ہے کہ کسی بھوکے کو کھانا کھلانا بڑے ثواب کا کام ہے۔ ''يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ '' (۹۰:۱۵۔۱۶) یہ کھانا کسی رشتے کے یتیم کو کھلانا ہوتا ہے یا کسی ایسے اُفتادہ پڑے ہوئے مسکین کو۔ یہ اِس ارشاد کا ظاہری پہلو ہے،

مگر اِس کا باطنی پہلو یوں ہے کہ کسی یتیم کو یا کسی مسکین کو کھانا کھلانا یوں ہے کہ علمِ دین کو افرادِ مومنین میں عام کر دیا جائے کیونکہ ظاہری پہلو کو لیا جائے، تو اِس میں بات محدود ہو جاتی ہے، ایک یتیم کو کھانا کھلانا یا کسی مسکین کو کھانا کھلانا، یہ آسان بات ہے اور پھر یہ ثواب ایک غلام کو آزاد کرنے کے ثواب کے برابر ہو جائے، یہ مشکل بات ہے۔ لہٰذا اِس کی تاویل ہے اور وہ تاویل یہ ہے کہ رُوحانی کھانا جو ہے وہ علمِ دین ہے تو علمِ دین کے سلسلے میں کوشش کی جائے اور سچے دین کے علم کو عام کر دیا جائے یعنی علمی طور پر خدمت کی جائے، تو پھر اِس کا ثواب اتنا ہو گا جتنا کہ کسی غلام کو آزاد کرنے کا ہوتا ہے، اور اِس کا (connection) ہے کہ انسان جب اپنی ہستی کو آزاد کر لیتا ہے، تو تب یہ رُوحانی کھانا بھی ممکن ہو جاتا ہے اور وہ اُن کو کھلا سکتا ہے جن کو کھلانا چاہیئے۔ ایک طرح سے اِس کی تاویل یہ بھی ہے کہ یتیم امام کو کہا جاتا ہے اور مسکین حجّت کو کہا جاتا ہے۔ اگر آپ امام کے بچوں میں علم کا دسترخوان بچھاتے ہیں تو گویا کہ آپ ایک طرح سے امام کے لئے مہمانی کرتے ہیں اور پیر کے لئے مہمانی کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ کام اُن سے منسوب ہو جاتا ہے اور جو لوگ شکر گزار ہوں گے تو وہ امام کے لئے شکر گزار ہوں گے اور جو خوش ہوں گے تو وہ پیر سے ہوں گے جس نے اِن کو یہ رستہ بتایا، اور آپ کو ثواب اتنا ملے گا جیسے آپ نے امام کے لئے مہمانی رکھی اور پیر کے لئے دسترخوان بچھایا، تو آپ نے جو کام کیا وہ امام سے منسوب ہو جائے گا گو کہ یہ کام لوگوں کے لئے مفید ہے۔

لیکن امام اپنی ذات کے لئے لے لیگا، اور پیر اِس سے خوش ہو جائے گا کیونکہ پیر کا جو منصوبہ تھا اُس کو آپ پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں، پیر کا منصوبہ کوئی ادھورا تو نہیں تھا کسی منزل تک پہنچانے کا کام تھا اور پیر اِس وقت موجود نہیں ہیں، پیر کے (mission) کو آپ آگے بڑھاتے ہیں، تو پیر آپ سے خوش ہو جائے گا جیسے آپ نے پیر کی طرف سے، پیر کے مریدوں کو، پیر کے حلقۂ دعوت میں، آپ نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے، تو آپ کا یہ جو دسترخوان بچھا ہوا ہے وہ شاہ کے لئے ہو گا اور پیر کے لئے ہو گا، تو یتیم دو معنوں میں امام کا ایک پوشیدہ نام ہے۔ امام کا کوئی باپ نہیں، کوئی ماں نہیں بنیاد سے، اِس معنیٰ میں بھی امام یتیم ہیں اور یتیم آپ لغات کو اُٹھا کر دیکھیں، یگانہ کو کہتے ہیں، یکتا کو کہتے ہیں، بے مثال کو کہتے ہیں۔ جس طرح اُس موتی کو جو صدف سے اکیلا نکلتا ہے، منفرد ہوتا ہے اُس کو کہتے ہیں دُرِّ یتیم اور حجّت یا پیر کا نام مسکین ہے اور مسکین تسکین سے ہے، سکون سے ہے کیونکہ حجّت کے علم سے ہم کو سکون ملتا ہے۔ یہی تو حجّت اور پیر کی صفت ہے کہ وہ جو علم بیان کرتا ہے، اُس میں سکون ہے، تسکین ہے، تسلّی ہے اِس لئے مسکین کی تاویل پیر ہے، حجّت ہے، تو جو بھی علمی خدمت کرتا ہے وہ مومنین کے درمیان ایک دسترخوان کو بچھاتا ہے، وہ امام کے لئے بچھاتا ہے اور پیر کے لئے بچھاتا ہے لیکن کھاتے مومنین ہیں اور یہ مہمانی منسوب ہوتی ہے امام سے اور پیر سے۔

"ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ" (۹۰:۱۷) اور جو لوگ

ایسا کریں گے، تو وہ پھر اُن لوگوں میں سے ہو جائیں گے جنہوں نے صحیح طور پر ایمان لایا ہے اور وہ ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں اور رحم کی تلقین کرتے ہیں۔ ''اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ ''(۱۸:۹۰) ایسے لوگ اصحابِ یمین میں سے ہیں۔ اصحابِ یمین اُن کو کہتے ہیں جن کا مرتبہ (right hand) کی طرف ہے اور اُن کے اعمال نامے (right hand) میں آئیں گے، کیونکہ قیامت کے دن اعمال کے، اعمال نامہ کے آنے کے اعتبار سے تین گروپ ہیں۔ جو بُرے لوگ ہیں اُن کے لئے اعمال نامہ بائیں جانب سے آئے گا (۲۹:۶۹) جو اچھے لوگ ہیں اُن کے لئے اعمال نامہ داہنی طرف سے آئے گا (۱۹:۶۹) اور جو مقرّبین ہیں اُن کے لئے سامنے سے اعمال نامہ آئے گا (۵۶:۱۰۔۱۱) تو ''اَصۡحٰبُ الۡيَمِيۡنِ'' (۵۶:۲۷) وہ لوگ ہیں جن کا اعمال نامہ داہنی طرف سے آئے گا، تو ایسے لوگ جو یہ کام کرتے ہیں، جو یہ خدمت کرتے ہیں اور جو یہ دسترخوان بچھاتے ہیں اُن کے اعمال نامے داہنی طرف سے آئیں گے اور وہ ''اَصۡحٰبُ الۡيَمِيۡنِ'' کہلائیں گے۔

''وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِنَا هُمۡ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ''(۱۹:۹۰) اور جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں وہ لوگ شامت والے ہیں، یعنی اُن کے اعمال نامے بائیں جانب سے ملیں گے یعنی آیات کو جھٹلانے والے کون ہیں؟ کہ آیات جو ہیں خدا کے پیغمبر ہیں اور آیات حضراتِ ائمّہ ہیں (اور جن کو جھٹلایا جائے) اور جو لوگ اِن کو جھٹلاتے ہیں وہ کافر کہلاتے ہیں۔

''عَلَيۡهِمۡ نَارٌ مُّؤۡصَدَةٌ ''(۲۰:۹۰) اُن پر ایسی آگ ہے کہ وہ بند کی گئی ہے۔ آگ دو قسم کی ہوسکتی ہے، کھلے بیابان میں، میدان میں آگ ہے تو وہ بند نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ اُس پر بارش برسے، ہوسکتا ہے کہ اُس کو ہوا بجھائے لیکن جو آگ کسی بند کمرے میں ہو اور جلتی ہو تو یہ علامت ہے کہ وہ آگ ہمیشہ رہنا چاہتی ہے۔ آگ کی تاویل جہالت و نادانی ہے اور دُنیا میں جن لوگوں کو دین کا علم نہیں ملا ہے، دین کی حقیقت نہیں ملی ہے اور اُن کو شناخت حاصل نہیں ہوئی ہے حق کی، حقیقت کی اور کھل کر کہیں تو امامِ زمان کی، تو وہ آتش نادانی میں مبتلا ہیں اور یہ نادانی کی جو آگ ہے اُن کو ہر وقت جلاتی رہتی ہے اور اِن سے یہ ہٹتی نہیں ہے۔ اِس معنیٰ میں اِس کو بند آگ کہا گیا ہے۔ اِسی کے ساتھ یہ سورہ ختم ہو جاتا ہے اور یہ (۲۰) آیات کا سورہ ہے اور مختصر ترجمہ اور کچھ تاویلات کے ساتھ یہ سورہ یہاں پر ختم ہو جاتا ہے۔ اگر اِس سلسلے میں کسی عزیز کا کوئی سوال ہو تو بیشک پوچھا جاسکتا ہے، شکریہ۔

سوال: سر! آپ نے گھاٹی کا مطلب فرمایا کہ رُوحانی اور جسمانی مشکلات سر! حضرت محمدؐ کے قصّے میں شاید واضح طور پر سر ایک ایسی گھاٹی کا ذکر ہے جس میں وہ تین سال کے عرصے تک بند رہے اپنے کچھ عزیزوں کے ساتھ سر! تو شاید دیکھنے میں یہ ایک ظاہری واقعہ ہے تو کیا اُس کے پس منظر میں کسی رُوحانی امتحان یا اُس طرح کے عذاب کا، کسی رُوحانی امتحان کا ذکر بھی ہوسکتا ہے سر؟

جواب: ہاں! تو جیسا کہ میں نے اِس درس میں عرض کیا تھا کہ (law of nature) پیغمبر، امام اور مرید پر ایک طرح سے یکسان ہے یعنی مراحل کے اعتبار سے اور آزمائشوں کے لحاظ سے اور جو مشکلات ہیں اُن کے اعتبار سے، اِس لئے عظیم پیغمبروں پر بڑی بڑی بلائیں آتی ہیں، ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی، اور اِن تکالیف کے بغیر وہ صابر نہیں کہلا سکتے ہیں، اور صبر کا جو تقاضا ہے یا جن کیفیات سے صبر بنتا ہے یا صبر کی جو شرطیں ہیں، تو وہ سب سے پہلے پیغمبروں میں پوری ہوتی ہیں۔ اِس لئے ظاہر میں جو احوال انبیائے کرام کے سامنے گزرتے ہیں باطن میں بھی اُن جیسے احوال ہوتے ہیں جیسے مانا جائے، تو غار میں بھی تاویل ہے کہ آنحضرتؐ غارِ حرا میں کیوں عبادت کرتے تھے کہ غار کی ایک تاویل تقیہ ہے یعنی احوال کو یا بھیدوں کو پوشیدہ رکھنا، اور اِس کے علاوہ بھی جس طرح اصحابِ کہف کا قصّہ ہے، تو اُس میں غار والے تو اُس میں غار والے، اِن غار والوں سے ظاہر میں وہ غار والے ہوں گے ہی لیکن باطن بھی ایک غار کا ہونا ناگزیر ہے، تو یہ آپ کے اِس سوال کا مختصر سا جواب ہے۔

سوال: سر! جس طرح آپ نے اپنے پہلے بھی لیکچر میں بتایا ہے کہ دُنیا کے اندر ہر چیز جوڑوں میں پائی جاتی ہے جس طرح دن کے ساتھ رات، اور شیطان کی قوت کے ساتھ امام، قوتِ خداوندی بھی ساتھ ہے، تو سوال کچھ اِس طرح ہے کہ دُنیا میں ہر چیز جوڑوں میں ہے تو فرشتوں کو کس طرح جوڑوں میں بنایا گیا ہے؟ فرشتوں کے بالمقابل کون سی چیز ہے جو اِس جوڑے کو مکمل کرے؟

جواب: اِنہوں نے جیسے سوال کیا وہ آپ عزیزوں نے سُن لیا اور جواب یوں عرض ہے کہ فرشتوں کو جسم کے اعتبار سے لیا جائے تو وہ لطیف ہونے کی بنا پر کثیف کے ساتھ (negative positive) کا کام کرتے ہیں یعنی وہ ضدّ ہیں کثیف کے اور خیر و شر کے اعتبار سے دیکھا جائے تو شیاطین ضدّ ہیں فرشتوں کے اور فرشتے ضدّ ہیں شیاطین کے اور یہ اعتبار اور لحاظ کی بات ہے، یعنی ہستی، یعنی جسم کے اعتبار سے وہ لطیف جسم میں ہیں، اِس لئے وہ انسانوں کے مدِمقابل ہیں اور جہاں خیر و شر کی بات ہے اُس میں فرشتے خیر کی طرف ہیں اور شیاطین جو وہ بھی لطیف جسم رکھتے ہیں وہ شر کی طرف ہیں، تو اِسی طرح ہر فرد اپنے کئی پہلوؤں سے، کئی اضداد رکھتا ہے۔ یہ آپ کے سوال کا مکمل جواب ہے۔

سوال۔ سر! اِس آیت کی کچھ مزید وضاحت فرمائیں گے: "وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ" کس طرح آنحضرت ﷺ جو تھے وہ اساس میں داخل ہونے والے تھے؟ کیا اُن کے نور کی منتقلی کی بات ہے اِس میں؟

جواب: اِنہوں نے "وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ" کی آیت کے بارے میں سوال کیا۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرتؐ جب رحلت کرنے والے تھے تو اُس میں آپ کا نور، آپ کی ہستی، آپ کی مرتبت، آپ کا وجودِ لطیف مولا علیؑ میں منتقل ہو جانے والے تھا اور اِس سلسلے میں میں نے عرض کیا تھا کہ جس طرح حدیث میں ہے کہ اساس ناطق کی قبر اور قائم

حضور کے منبر تھے۔ قبر اِس معنیٰ میں کہ آنحضرتؐ کا نور اساس میں منتقل ہوگیا، منبر اِس معنیٰ میں کہ قائم القیامت سے شانِ محمدی کا ظہور ہونے والا ہے، اُس کے بھید ظاہر ہونے والے ہیں، اسلام کے اور پیغمبر کے اسرار قائم کے ذریعے سے نمایاں ہونے والے ہیں، خواہ یہ قیامت انفرادی ہو یا اجتماعی، اُس کی بحث نہیں ہے۔ اِس لئے قائم القیامت کو منبر یعنی (stage) یا (dais) کہا گیا اور حالانکہ دیکھیں کہ اگر دُنیا کی کسی عام زندگی کی بات ہوتی تو اُس میں (stage) یا (dais) یا منبر کا ذکر پہلے آنا چاہئے اور قبر کا ذکر بعد میں ہونا چاہئے۔ اِس بیان کی ترتیب اِس عام ترتیب سے الگ ہے یا اِس کے برعکس ہے کہ پہلے قبر کا ذکر ہے اور اُس کے بعد (dais) کا ذکر ہے۔ مطلب اِس کا یہ ہوا کہ پہلے آنحضرتؐ اساس میں منتقل ہو جائیں گے نور کے لحاظ سے، پھر اُس کے بعد حضرت قائم کے زمانے میں یعنی آنحضرتؐ کی حیثیت اسلام کو ظاہر کرے گی، آپ کی مرتبت، آپ کی جانشینی یہ کام کرے گی کہ اسلام کے اور نبوّت کے بھید ظاہر ہونے لگیں گے، اِس معنیٰ میں قائم القیامت کو (stage) یا (dais) یا منبر کہا گیا اور جہاں اساس کو شہر کہا گیا کہ یہ قرآن کا عام اُصول ہے کہ کبھی کسی ہستی کو "قَرْيَةٌ" کہا جاتا ہے، کبھی شہر کہا جاتا ہے، کبھی گھر کہا جاتا ہے، کہ حقیقت ایک ہے اور مثالیں بہت سی۔ اِسی کے ساتھ آپ کے سوال کا جواب دیا گیا۔

سوال: ہدایت کا خیر کا وسیلہ ظاہر میں امام ہے تو شر کا وسیلہ شیطان ظاہر میں کس شکل میں ہے؟

جواب: اِنہوں نے جس طرح سوال کیا وہ آپ نے سُن لیا۔ جواب یوں عرض ہے کہ خیر اور شر خدا نے دو چیزیں بنائی ہیں اور انسانوں کی زندگی کے سامنے جو کچھ ہے وہ اِسی خیر سے متعلق ہے یا شر سے متعلق ہے اور خیر و شر کے دو ذرائع [ہیں]، تو خیر کا وسیلہ، رہنما امام ہے یعنی راہِ راست پر چلانے والا اور منزلِ مقصود تک پہنچانے والا امام ہے۔ اب اِس ہادی کے برعکس میں جو لفظ آتا ہے وہ مضّل ہے، گمراہ کُن، وہ شیطان ہے اور اِنہوں نے یہ پوچھا کہ ظاہر میں شیطان کی کیا کیفیت ہے؟ میں نے عرض کیا تھا کہ شیاطین دو قسم کے ہوتے ہیں، شیاطین الجنّ اور شیاطین الانس۔ لفظ میں پہلے شیاطین الانس، انسانوں میں سے شیاطین، جنّات میں سے شیاطین، اِس طرح ترتیب ہے، تو دُنیا میں جو شخص علم کا دعویٰ کرتے ہوئے لوگوں کو اصل راہ سے گمراہ کرتا ہو وہ شیطان ہے اور اگر کچھ زیادہ وضاحت کے ساتھ کہنا ہو تو جو لوگ امام کے برعکس لوگوں کو چلانے کی کوشش کرتے ہیں یا جو مومنین کو گمراہ کر دیتے ہیں وہ شیاطین ہیں، شیاطین اِنسی ہیں، انسانی شکل کے شیاطین اور اُن کی رُوحیں شیاطین جنّی ہیں۔ ہم نے اپنی تحریروں میں اِس سلسلے میں کافی باتیں کی ہیں۔ اِس کے ساتھ اِس سوال کا جواب بھی مکمل ہو جاتا ہے۔

سوال: "عَقَبَة" (۹۰:۱۲) کے سلسلے میں اور گھاٹی کے سلسلے میں جن رُوحانی مشقتوں کا ذکر ہوا ظاہری مشقتوں کے ساتھ ساتھ تو اور یہ بھی آپ نے فرمایا کہ آئمہ اور انبیاء بھی اِنہی مراحل سے گزرتے ہیں، تو کیا اِس میں کوئی عمر کی قید ہے سر!

یعنی کوئی وقت درکار ہے یا جس طرح ہم دیکھتے ہیں تاریخ میں بھی جس طرح ہمارے بہت سارے ائمّہ بہت ہی کم عمر میں ائمّہ کے، امام کے درجے پر فائز ہوئے، اِس میں کوئی بات ہے سر! کیا آپ وضاحت فرمائیں گے، مہربانی۔

جواب: بہت (important question) ہے اور اِس میں کافی عمدہ علم آسکتا ہے، بڑی دانشمندی سے پوچھا گیا کہ امامت کسی بھی مرحلے میں مل سکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ رُوحانیت کے تمام مراحل طے ہو جائیں، تو پھر کوئی امام بنے بلکہ اِس میں (exceptional cases) کہیئے یا امام کا اختیار کہیئے، کسی بھی عمر میں امام کو امام بنایا جاتا ہے لیکن امام کے بننے کے بعد جو (stages) ہیں وہ یکے بعد دیگرے طے ہوتے جاتے ہیں۔ اگر ہم باریکی سے پیغمبروں کی حیاتِ طیّبہ کی (study) کریں قرآن کی روشنی میں تو اُس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ کسی پیغمبر نے جو کچھ کہا وہ کسی مرحلے میں کہا، پہلے کہا یا بعد میں کہا۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی ملاقات ایک ایسی شخصیت سے ہوئی جس کو عام طور پر خضر مانا جاتا ہے لیکن وہ خضر نہیں تھے، وہ کوئی رُوحانی ہستی تھی۔ اُس سے آپ دیکھتے ہیں کہ تاویل کی باتیں ہوتی ہیں لیکن اُس وقت موسیٰ علیہ السّلام میں برداشت نہیں ہوتی ہے، بار بار مُخل ہو جاتے ہیں، اپنے اُستاد کے کاموں میں اعتراض کرتے جاتے ہیں لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ یہ آخری مرحلے کی بات ہے۔ پیغمبر تو تھے اور خود وجہِ دین کے اندر آنحضرتؐ پیغمبر تو تھے لیکن ابھی معراج نہیں ہوئی تھی، لہٰذا کچھ احکام پہلے صادر ہوئے تھے لیکن بعد میں معراج کے، اُن میں ترمیم ہوئی۔ اِس سے بھی ظاہر ہے کہ نبوّت جو ہے وہ کمال کی طرف جاتی رہتی ہے۔ اِس طرح حضرات ائمّہ ہیں کہ اُن میں سے بعض کو بہت پہلے امامت ملتی ہے اور بعض کو بعد میں امامت ملتی ہے، تو کسی بھی مرحلے میں امامت ملتی ہے اور وجہِ دین میں یہ بھی ہے کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السّلام جنگِ کربلا کے بعد امام ہو گئے۔ ابھی یہ نہیں معلوم کہ حضرت امام حسین علیہ السّلام نے وصیت کی تھی یا نہیں کی تھی لیکن وہ امام ہو گئے۔ اِس لئے کہ قرآن میں ایک (special) آیت ہے: ''یَکَادُ زَیۡتُہَا یُضِیۡٓءُ وَ لَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡہُ نَارٌ'' (۳۵:۲۴) اُس تیل میں یہ صلاحیت ہے کہ اگر اُس کو آگ نہ بھی چھوئے تو پھر بھی وہ قریب ہے کہ روشن ہو جائے۔ پیر ناصرِ خسروؒ بتاتے ہیں کہ یہ جو آیت کا حصّہ ہے حضرت امام زین العابدین کی شان میں ہے یعنی ظاہری طور پر سب کچھ اہتمام نہیں ہوا تھا کہ حضرت امام زین العابدین امام ہو جائیں گے لیکن وہ (exceptional case) ہے کہ اُن کو امام ہونا تھا تو خدا کی مشیّت اور اُس سلسلے میں جو منشاء ہے، جو صلاحیت ہے اُس کی بنا پر امام ہو گئے، تو کوئی بھی قانون جو ہوتا ہے اُس میں ایک طرف سے عام اُصولات ہوتے ہیں، قوانین ہوتے ہیں یعنی جو بھی قانون ہوتا ہے وہ چند قوانین کا مجموعہ ہوتا ہے یا چند اُصولات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اُن قوانین کے ساتھ ساتھ کچھ (exceptional case) بھی ہوتے ہیں۔ اُن (exceptional case) کو مستثنیات کہنا چاہیئے، تو کوئی بھی قانون (exceptional case) کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا ہے یہ اُس میں گنجائش ہوتی ہے، ہر قانون میں یہ ہوتا ہے۔

بالفاظِ دیگر، اِس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ ایک ہوتا ہے قانون اور ایک ہوتا ہے قانون ساز، تو جو قانون ساز ہے وہ اپنے قانون میں ہر وقت کچھ ترمیمات کرسکتا ہے، اُس میں تجدید کرسکتا ہے۔ جیسے امامت کے قانون میں آپ دیکھتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السّلام سے امامت چلی آئی ہے اور باپ کے بعد بیٹا امام ہوتا آیا ہے مگر حضرتِ ابراہیم علیہ السّلام کے زمانے میں آ کر اِس سلسلے کی دو شاخیں پیدا ہوگئیں ہیں یعنی حضرت اسماعیل علیہ السّلام بھی امام تھے جو امامِ مستقر تھے اور حضرت اسحاق علیہ السّلام بھی امام تھے جو امامِ مستودع تھے، تو حضرت اسماعیل کی نسل سے ائمّہ مستقر ہوتے آئے اور حضرت اسحاق کی نسل سے ائمّہ مستودع ہوتے آئے اور آنحضرتؐ کے زمانے میں آ کر پھر یہ جو حضرت اسحاقؑ کی اولاد میں امامت تھی وہ بھی اِس طرف کو لوٹ آئی، حضرت ابوطالبؑ کی طرف آ گئی اور حضرت ابوطالبؑ سے مولا علی میں دونوں امامتیں یکجا ہوگئیں۔ پھر حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ پر آ کر اِس کا ایک اور (demonstration) ہوگیا۔ یہ (exceptional case) تھا لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا ہے۔ پھر دیکھیں کہ اِس دَور میں بھی ایک انوکھی بات ہوئی، ہر چند کہ ہم یہ مانتے ہیں کہ باپ کے بعد بیٹا امام ہوتا ہے لیکن شاہ کریم حاضر امام کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا، کہ امامت دادا جان سے پوتے میں منتقل ہوئی، تو اِسی طرح عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ امام، امامت کے، روحانیت کے کئی مراحل سے گزرتا ہے تو امام بن جاتا ہے لیکن کبھی کبھی بہت پہلے بھی امامت آتی ہے۔

اِس سلسلے میں ایک اور دلیل میں یہ بتانا چاہوں گا کہ قرآن میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوّت نوجوانی میں ملتی ہے کیونکہ حکمت اُس عمر میں آسکتی ہے لیکن حضرت عیسیٰؑ کے معاملے میں یہ ایک (exceptional case) ہو جاتا ہے کہ اُن کو بچپن میں نبوّت ملتی ہے گو کہ اِس میں بھی تاویل ہے لیکن ظاہر میں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ بچپن میں اُن کو نبوّت ملتی ہے، تو یہ بات ایسی ہے اور آپ کا سوال بڑا عمدہ تھا، شکریہ۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپ: مہر انگیز عظیم نظرِ ثانی: اکبر علی پُروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

Click here for Audio

عنوان: سورۂ ص

کیسٹ نمبر: Q-46-A   تاریخ: ۲۷/جنوری/۱۹۸۴ء کراچی

آپ سب عزیزان اپنی درویشانہ دعاؤں میں مولا سے یاری چاہیں کہ وہ ہم سب کو توفیق عنایت فرمائے، تاکہ اِس خاص وقت سے فائدہ اُٹھاسکیں کیونکہ آپ کے نزدیک اور ہمارے نزدیک یہ وقت خاص وقت ہے اپنی زندگی میں سے، اِس لئے کہ ہم اہتمام سے اِس وقت کو گزارتے ہیں علم کی باتوں میں، دین کی باتوں میں اور خداوند کی یاد میں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ وقت ہماری زندگی میں سے عزیز ترین وقت ہے، ہم اِس وقت کو یاد کریں گے اور توقع ہے کہ اِس وقت سے ہم کو بہت کچھ عقلی اور رُوحانی طور پر فائدہ ملے گا کیونکہ ہم سب اِس میں خلوص سے جمع ہوجاتے ہیں اور بڑے شوق سے اِس میں حاضری دیتے ہیں۔ آپ سب عزیزوں کے اوقات کو دیکھیں تو کتنے عزیز ہیں، کتنے گرانقدر ہیں آپ کے اوقات، جوہرات کی طرح قیمتی اور انمول لیکن اِس کے باوجود آپ عزیزان بڑی اُمیدوں کے ساتھ اور اعتماد کے ساتھ یہاں حاضر ہو جاتے ہیں تاکہ آپ اپنے پیارے دین کی باتیں سنیں اور خاص کر رُوحانیت کی باتیں، قرآنِ پاک کی باتیں، جبکہ لوگ اسماعیلیوں کی بابت یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ اسماعیلیوں کے پاس قرآن کا علم نہیں ہے۔ ایسے میں ہمیں بڑی عاجزی کے ساتھ خداوند سے دُعا مانگنی چاہئے تاکہ وہ ہمیں خصوصی توفیق عنایت فرمائے، تاکہ ہم اِس قرآنی علم کے بارے میں کچھ خدمت انجام دے سکیں۔ ہم مل کر خدمت انجام دے سکیں اور عجب نہیں کہ واقعاً ہم سے اِس میدان میں کچھ خدمت انجام پائے۔

اِس لئے عزیزانِ من! میں پُرزور گزارش کرتا ہوں، درخواست کرتا ہوں کہ آپ اِس کام میں مضبوطی سے، دل جمعی سے اور شوق سے آگے بڑھنا۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کے لئے خداوند کی کچھ رحمتیں، کچھ مہربانیاں منتظر ہیں اور کوئی شک نہیں کہ قرآن امام کے ساتھ ہے اور اِس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ قرآنی نعمتیں امام کے مریدوں کے لئے خاص ہیں۔ لہٰذا آپ بڑے شوق سے اِس میں دلچسپی لیں، اور چند سالوں کے اندر اندر آپ قرآن کے ضروری علوم کو اپنائیں اور اپنے سینوں کو علم قرآن کے نور سے منوّر کرلیں۔ آج میں بڑی عاجزی کے ساتھ اور انتہائی ادب کے ساتھ خداوند سے یاری چاہتے ہوئے اور آپ کی دُعاؤں کے لئے اظہارِ حاجت مندی کرتے ہوئے سورۂ ص کی آیت ۴۱ سے شروع کرتا ہوں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡـمٰنِ الرَّحِيۡـمِ ۝ وَاذۡكُرۡ عَبۡدَنَاۤ اَيُّوۡبَ‌ۘ اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىۡ مَسَّنِىَ الشَّيۡطٰنُ

بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ (۴۱:۳۸)اے رسولِ پاک! آپ ہمارے بندے ایوب کو بھی یاد کیجئے کہ اُس نے جب اپنے پروردگار کو پکارا یہ کہتے ہوئے کہ مجھ کو شیطان نے ہاتھ لگایا ہے تکلیف اور عذاب کے ساتھ۔ حضورؐ سے یہ فرمانا کہ آپ ہمارے بندے ایوب کو یاد کیجئے، یہ توجہ دِلانا ہے آنحضرتؐ کو واقعاتِ رُوحانیت کی طرف جن میں ہر پیغمبر کی رُوحانی سرگزشت محفوظ ہوتی ہے۔ خداوندِ عالم اپنی رحمت سے آنحضرتؐ کو یہ توجہ دِلاتے ہیں کہ حضور اپنی رُوحانیت کے واقعات میں یہ دیکھیں کہ حضرت ایوب علیہ السّلام کا قصّہ کیا ہے اور خداوندِ عالم حوالہ دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ ایوب نے کہا کہ اے پروردگار مجھ کو شیطان نے ہاتھ لگایا ہے تکلیف اور عذاب کے ساتھ۔

ظاہری قصّہ آپ نے سُنا ہوگا جو کہتے ہیں کہ حضرت ایوب علیہ السّلام کے جسم میں ایک بیماری پیدا ہوئی تھی اور جس کے نتیجے میں اُن کے گوشت میں کیڑے پڑ گئے تھے اور اِس کا سبب یوں ہوا تھا کہ شیطان نے اُن کو ہاتھ لگایا تھا۔ یہ قصّے کا ظاہر ہے مگر آپ جانتے ہیں کہ یہ عجیب سی بات ہوتی ہے کہ خدا کے ایک دوست کو اتنی بیماری کہ گوشت سڑ جاتا ہے اور اُس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں اور سارے بدن پر گوشت کی کوئی بوٹی تک باقی نہیں رہتی ہے، یہ بات بہت عجیب بنتی ہے۔ ایسا نہیں ہے، بیماری تو ہوتی رہتی ہے، سخت اور نرم ہر قسم کی لیکن اتنی بیماری نہیں ہوتی ہے، اور اتنی بیماری ہو تو پھر انسان اِس دُنیا سے کوچ کر جاتا ہے۔ اصل بات یوں ہے کہ کچھ رُوحیں آتی ہیں، بڑے پیمانے پر جب رُوحانیت کا دروازہ کھل جاتا ہے، تو اُس وقت رُوحوں کی گویا بارش ہوتی ہے، گویا طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ ہمارے عزیزوں میں سے جن کو عرصے سے اِس قسم کی باتوں سے تعلق رہا ہے وہ تو فوراً ہی جانتے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں اور اِن رُوحوں سے میری کیا مراد ہے۔ رُوحانیت کے تین بڑے مراحل کا ذکر آپ نے سُن لیا ہے، بلکہ آپ کے ہاتھ میں مقالے بھی آچکے ہیں کہ شروع شروع میں جو رُوحانیت ہوتی ہے وہ بہت ہی خاموش اور معمولی قسم کی ہوتی ہے، اُس میں صرف روشنی ہوتی ہے اور سچ بات تو یہ ہے کہ وہ خاموش اور بے جان سی رُوحانیت ہوتی ہے، گو کہ اُس میں رنگینیاں بہت زیادہ ہوا کرتی ہیں، اُس کی بہاریں عجیب و غریب ہوتی ہیں اور وہ ایک روشن اور منوّر دُنیا ہوتی ہے، اور بعض اعتبار سے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ جو دُنیا ہوتی ہے رُوحانیت کی، وہ یہی دُنیا ہوتی ہے۔ جس طرح کسی صاف و شفاف تالاب میں جو کسی باغیچے کے درمیان ہو تو اُس کے کنارے پر جو پھول کھلے ہیں، جو درخت کھڑے ہیں، جو درختِ سرو جھومتا ہے وہ سب اِس صاف و شفاف پانی میں اُس کا عکس پڑتا ہے، اِسی طرح جب انسان اپنے باطن کا تزکیہ کرتا ہے یعنی اِس کو صاف اور پاک کرتا ہے تو اُصولاً سب سے پہلے یہ ہونا چاہئے کہ اِس آئینے میں سب سے پہلے دُنیا کا تجربہ ہو یعنی دُنیا کی چیزیں اِس میں جھلکنے لگے اور یہی ہوتا ہے۔ وہ آخرت نہیں ہے ابھی، صرف آئینے کی پاکیزگی ہوئی، صفائی ہوئی، کُدورت دُور ہوگئی، اب سب سے پہلے اِس میں جو عکس پڑے گا، اِس میں جو (reflection) ہوگا وہ دُنیا کا ہوگا۔ لہٰذا اُس میں اصل رُوحانیت نہیں ہے ایک اعتبار سے،

ایک اعتبار سے آپ اُس کو رُوحانیت کہہ سکتے ہیں لیکن دوسرے اعتبار سے اِس کو آپ دُنیا کہہ سکتے ہیں کیونکہ اُس میں دو عنصر ہیں۔ایک تو آئینہ ہے وہ رُوح ہے،اور دوسرا اُس میں عکس ہے جو دُنیا ہے۔لہٰذا ہم نے اپنے مقالے میں یہ کہا تھا کہ وہ دُنیا ہے مگر رُوحانیت کی دُنیا اور گویا کہ اُس کو رُوحانی جنم کہنا صحیح ہے۔اب آخرت کہاں سے شروع ہوگی؟ اُس حالت سے آگے بڑھے،ایک بار اُسی حال میں آدمی مرجائے،عزرائیل آئے اور مومن کی رُوح کو قبض کرے اور قیامت برپا ہوجائے تو تب صحیح معنوں میں آخرت کہلائے گی وہ حالت،اور پھر وہ روحانیت ہوگی۔

لہٰذا وہ دُنیا ہے اور اُس میں بہت رنگینیاں ہیں،اِس لئے کہ یہ دُنیا کی چیزیں آئینۂ رُوح میں نظر آرہی ہیں،تو حضرت ایوب علیہ السّلام کو جو بیماری لگی اُس کی وجہ قرآن بتاتا ہے کہ شیطان تھا اور جس سے اُن کو بیماری ہوئی تھی اور ٹھیک ہے،کہ جو شر ہے اُس کا ایک سرچشمہ ہے اور جو خیر ہے اُس کا بھی ایک سرچشمہ ہے تو شر کی جو بھی چیز ہو وہ اپنے سرچشمے سے آتی ہے اور خیر کی جتنی چیزیں ہیں وہ اپنے سرچشمے سے آتی ہیں۔لہٰذا بیماری شیطان سے آتی ہے اور بیماری اُسی سے منسوب کی گئی ہے، تو بات یہاں تک آئی تھی کہ رُوحیں آتی ہیں اُس وقت جبکہ انفرادی یا ذاتی قیامت برپا ہوجاتی ہے،تو اُس حال میں نہ صرف رُوحوں کی ایک بہت بڑی بارش برستی ہے بلکہ یہ کہنا صحیح ہے،کہ وہاں پر ایک طوفان رُوحوں کا برپا ہوجاتا ہے،تو جب رُوحوں کا طوفان برپا ہوجاتا ہے،تو اُن رُوحوں سے ہزارگونا مثالیں بن جاتی ہیں،اچھی مثالیں،بُری مثالیں،ہر قسم کی مثالیں،ہزارگونا مثالیں بن جاتی ہیں۔اُن مثالوں میں سے ایک مثال یہ بھی ہے جیسے کسی کے جسم میں کیڑے پڑ گئے اور حضرت ایوب علیہ السّلام کے بارے میں جس بیماری کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ اِس طرح سے ہے۔چنانچہ اُن رُوحوں نے اُن کو تکلیف دی،اُن رُوحوں نے تکلیف دی اور چونکہ مصائب وآلام رُوحانیت میں آتے ہیں اور صحیح معنوں میں صبر بھی اِن رُوحانی مصیبتوں کے جھیلنے سے بنتا ہے۔صبر کے بارے میں جو مقالہ ہے اُس کے پڑھنے سے یہ بات آپ کے علم میں آئے گی کہ صبر صحیح معنوں میں انبیاء اور ائمّہ علیہم السّلام کی ذاتِ گرامی سے متعلق ہے اور صبر کا لفظ کسی غیر مسلمان کے لئے یا کسی کافر کے لئے استعمال نہیں ہوا۔جب ہم غور سے دیکھتے ہیں،تو اُس کے نتیجے میں معلوم ہوتا ہے کہ صبر اِس قسم کی مصیبتوں کے برداشت کرنے کا نام ہے جن کا یہاں ذکر ہورہا ہے۔چنانچہ حضرت ایوب علیہ السّلام کو صبر کا نمونہ کہا جاتا ہے حالانکہ جیسا کہ آپ کا اور ہمارا ایک اُصول ہے،وہ یہ کہ سب حضراتِ پیغمبر یکساں ہیں،اعلیٰ صفات میں، رُوحانیت میں لیکن خداوندِ عالم کی یہ عادت رہی ہے کہ کسی ایک صفت میں کسی ایک پیغمبر کو آگے کرتا ہے،یہ دیکھنے کے لئے، یہ آزمانے کے لئے کہ ہم جانتے ہیں یا نہیں،جیسے فرشتوں کے سجدہ کرنے کے سلسلے میں آدم کو آگے کیا لیکن مومنین جانتے ہیں کہ یہ بات ایسی ہے کہ تمام حضراتِ انبیاء میں مشترک ہے،اِسی طرح جس صبر کو حضرت ایوبؑ سے منسوب کیا جاتا ہے وہ صبر بھی تمام پیغمبروں میں اور خدا کے اولیاء میں مشترک ہے،تو اتنے ذکر کے بعد ارشاد ہے کہ:

''اُرۡكُضۡ بِرِجۡلِكَ هٰذَا مُغۡتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ''(۴۲:۳۸)اِس تکلیف کے دوران خداوندِ عالم سے یہ حکم آیا، حضرت ایوب علیہ السّلام کو کہ آپ زمین پر پاؤں ماریئے تا کہ اِس کے نتیجے میں ایک چشمہ نکلے گا ٹھنڈا سا، اِس میں سے پی لینا اور اُس میں غسل کرنا تا کہ آپ کی یہ بیماری ایک دم سے اِسی کے ساتھ آناً فاناً دفع ہو جائے۔ اِس میں تاویلی حکمت ہے، بظاہر یہ بات ممکن نہیں ہے کہ ایک پانی کے پینے سے ایک دم سے کسی کو شفا حاصل ہو، لیکن خداوندِ عالم حکمت کے بغیر معجزات دکھانا نہیں چاہتا ہے، ایسے معجزات کرنا چاہتا ہے کہ اُن میں عقل ہو، علم ہو اور (logic) ہو اور قانونِ فطرت کے مطابق ہر کوئی اُس کو سمجھے، سنے تو باور کرے، ایسے معجزات کرنا چاہتا ہے۔ زمین میں پاؤں مارنے کا مطلب یہ ہے، کہ کوئی مومن رُوحانیت میں جدو جہد کرے، (struggle) کرے اور ذکر و فکر کرے اور اِس کے نتیجے میں علم کا اور عقل کا ایک چشمہ روان دوان ہو جائے۔ اُس علم و عقل کے صاف و شفاف پانی کے پینے سے اور اُس میں نہانے سے کوئی فرد جہالت و نادانی کی بیماریوں سے شفایاب ہو سکتا ہے اور بات یہی تھی کیونکہ پورے قرآن میں جہاں کہیں بھی پانی کا ذکر آتا ہے، تو اُس کی تاویلی حکمت علم ہے یعنی اُس سے عقل مراد ہے اور علم مراد ہے، اور جہاں کہیں بیماری کا ذکر آتا ہے تو اُس میں سب سے بڑی بیماری عقلی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اگر کہیں عذاب کا ذکر آتا ہے تو وہ بھی سب سے بڑا عذاب جو ہے عقلی رنگ میں ہے، مقصد یہ ہے کہ جو جہالت و نادانی ہے اُس کی کئی مثالیں دی گئی ہیں اور دین میں جہالت و نادانی بہت بُری چیز ہے۔ کبھی جہالت و نادانی کی تشبیہہ آگ سے دی گئی ہے جو چیزوں کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے، کبھی جہالت و نادانی کی تشبیہہ جو ہے بیماری سے دی گئی ہے، کبھی اِس کی مثال عذاب سے دی گئی ہے، کبھی اِس کو تاریکی اور ظلمت کہا گیا ہے، تو یہاں پر جس بیماری کا ذکر چلتا ہے وہ یوں لگتا ہے کہ کسی مرحلے پر شیاطین نے حضرت ایوب علیہ السّلام کے لئے کچھ شکوک و شبہات پیدا کئے ہوں گے، ظاہری شیاطین نے یا باطنی شیاطین نے اور اِن شکوک و شبہات کا ازالہ کس طرح ہو سکتا تھا؟ اِس طرح کہ ذکر و عبادت سے کچھ جدو جہد کرے، کچھ (struggle) کرے تا کہ رُوحانیت میں سے ایک عقل و علم کا سرچشمہ روان دوان ہو جائے، اُسی میں نہائے اور اُسی میں سے پیئے تا کہ شکوک و شبہات کا جو مرض تھا وہ رفع دفع ہو جائے جو شیاطین سے پیدا ہوا تھا اور یہ عقل کے موافق توجیہہ ہے۔ دُنیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ جب بھی کوئی مومن کسی شک میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ کسی شیطان کی وجہ سے ہوتا ہے، کوئی بات سنتا ہے، کوئی اعتراض سنتا ہے، کوئی سوال سنتا ہے، تو وہ شخص اِس مومن کے حق میں کیا ہے؟ شیطان ہے، اُس شیطان نے اِس کو (touch) کیا یعنی ہاتھ لگایا، اب بیماری ہو گی یعنی شک ہو گا اور اِس بیماری کا ازالہ کس طرح سے ہو گا؟ اُس ٹھنڈے پانی میں نہانے سے جو امام کے معجزے سے روان دوان ہوتا ہے اور اُس پانی کے پینے سے، تو بات سمجھ میں آ گئی کہ حضرت ایوبؑ نے زمین میں پاؤں مارا یا لات ماری تو اِسی کے ساتھ ایک چشمہ پھوٹا اور اُس میں نہانے کے لئے فرمایا گیا تھا اور اُس کے پانی کو پینے کے لئے کہا گیا تھا

تو اِسی کے ساتھ اُن کی تکلیف دفع ہوگئی۔

''وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ''(۳۸:۴۳)۔

قصہ میں یہ بتاتے ہیں کہ حضرت ایوبؑ پر نہ صرف ایک بیماری آئی تھی بلکہ اُس کی ساری فیملی، اُس کی ساری اولاد ہلاک ہو گئی تھی یہاں تک کہ اُس کا مال، مویشی سب تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ خداوندِ عالم نے اُس کی اولاد کو اُسے واپس دِلایا یعنی وہ ساری اولاد اُس کی زندہ ہوگئی، اِسی دنیا میں، اور اُتنی اولاد اور ہوگئی۔ لیکن ظاہر میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایسے معجزے کہ جو مرے ہیں وہ دُنیا میں ایک دم سے لوٹ کر آئیں اِسی زندگی میں، وہ آ کر اپنی اپنی جگہ لیں تو خداوندِ عالم ایسے معجزات نہیں کرتا ہے۔ پروردگار اپنے دوستوں سے امتحان لیتا ہے، جو ایک بار امتحان لیتا ہے کسی کی اولاد لیتا ہے تو لیتا ہے بس اور اُس کے عوض میں بہشت کی سلطنت عطا کر دیتا ہے اور کسی پیغمبر کی کوئی اولاد واپس اِس دُنیا میں نہیں آتی ہے۔ اِس میں تاویل ہے، تاویل اِس طرح سے ہے کہ معجزات رُوحانیت میں ہوتے ہیں، جو رُوحیں آتی ہیں ایک بار، پھر وہ چلی جاتی ہیں یا ہلاک ہو جاتی ہیں، پھر اُن کی جگہ پر دوبارہ رُوحیں عطا کر دی جاتی ہیں۔ یہاں قرآنِ پاک میں جس طرح سے ارشاد ہوا ہے اُس کے مطابق یوں ہے کہ جو اولاد اُس سے چلی گئی تھی یا ہلاک ہوگئی تھی اُس کی جگہ پر نہ صرف اُتنی اولاد واپس دلائی گئی بلکہ اُتنی اور زیادہ اولاد اور اہل وعیال اور اُس کے لوگ اُن کو واپس دلائے گئے۔ اِس کی حکمت یوں ہے کہ رُوحانیت میں مقام دو ہیں، ایک مقامِ عقل ہے اور دوسرا مقامِ رُوح ہے۔ دُنیا میں کوئی کامیاب شخص، مومن، پیغمبر، امام اور پیر کے بعد جو ہیں اُن کو بہشت کی نعمتیں کس طرح ملتی ہیں؟ دُنیا میں مومن جیسا کام کرتا ہے اُس کے مطابق اُس کو صلہ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے امام کے لئے خدمت کی ہے، جماعت میں (service) کی ہے تو آپ کی اِس خدمت کے مطابق آپ کو صلہ ملے گا۔

کہنا یوں ہے کہ پیغمبر سے بہت سے لوگ وابستہ ہوتے ہیں، اُس کے اصحاب، اُس کے کارندے، اُس کے نمائندے، اُس کے حدودِ دین اور اُس کے بہت سے کام کرنے والے لشکر ہیں، تو خداوندِ عالم کے انعامات میں سے ایک انعام یہ ہے کہ پیغمبر کو اُس کے لوگ رُوحانیت میں ملتے ہیں اور بہشت میں ملتے ہیں۔ پیغمبر جن لوگوں پر مہربان تھا اور جن لوگوں کے ساتھ دُنیا میں وہ اللہ کا کام کرتا تھا، تو وہ سب لوگ پیغمبر کو دیئے جانے چاہئیں، اُن کو نوازنا چاہئے کہ جو لوگ دُنیا میں پیغمبر کے ساتھ تھے تو بہشت میں بھی اُن کو پیغمبر کے ساتھ ہونا چاہئے۔ جو لوگ دُنیا میں امام کے ساتھ، امام کے دین میں رہ کر، امام کی جماعت میں، امام کے کسی ادارے میں، امام کے کسی کام میں، امام کی کسی خدمت میں جس طرح سے کام کرتے تھے اِس طرح سے اِن کو ثواب ملے گا۔ آپ دُنیا میں جن کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں بہشت میں آپ اجر و صلہ کے طور پر اُن کے ساتھ آپ شادمان ہوں گے۔ یہی محفل ہوگی، یہی مجلس، یہی جمعیت تو ایوب علیہ السّلام کو اُن کی آل

دینے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے اصحاب، اُن کے ساتھی، اُن کے حدودِ دین رُوحانیت میں دیئے گئے، مقامِ رُوح پر اور پھر مقامِ عقل پر بھی اِن جیسے افراد اُن کو ملے۔ جیسے سورۂ رحمٰن میں فرمایا گیا ہے کہ جَنات یا باغ جو ہیں وہ دو ہیں[۵۵:۶۲]، باغات بہت ہیں لیکن اُن باغات کی تقسیم مختلف اعتبارات سے ہے، تو عقل اور رُوح کے اعتبار سے جو رُوحانیت کی تقسیم ہے وہ دو حصّوں میں ہے۔ نچلا باغ رُوحانیت کا ہے اور اُوپر کے درجے کا باغ جو ہے وہ عقل سے متعلق ہے، عقلی صورت میں ہے، تو ایوبؑ کے ساتھ جو لوگ دُنیا میں تھے، یہ اُن کو رُوحانیت میں بھی دیئے گئے اور مقامِ عقل پر بھی دیئے گئے اور پھر آیت کے آخری حصّے میں ہے کہ:

''وَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ''(۳۸:۴۳) اور اِس میں عقل والوں کے لئے نصیحت ہے۔ کسی بھی رحمت کو (common) کرنا ہو تو اُس میں ایک ایسا اشارہ ملتا ہے یعنی اللہ کا یہ فرمانا کہ اِس میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں یا عقل والوں کے لئے نصیحت ہے، تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ رحمت یا یہ انعام نہ صرف پیغمبر کے لئے ہے بلکہ مومنین کے لئے بھی ہے، جس طرح ابھی ابھی بات ہوئی تھی، دُنیا میں آپ جس شان سے یا جس صورت میں خدمت کرتے ہیں قیامت میں، بہشت میں آپ کو اِس کا اجر وصلہ کچھ اِس طرح سے آپ کو ملے گا اور جیسے حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کا ارشادِ گرامی ہے کہ: قیامت کے دن مومنین ایک دوسرے کو دیکھ کے شادمان ہو جائیں گے۔ آپ ذرا اِس کی گہرائی میں جائیں، کیوں شادمان ہو جائیں گے؟ دُنیا میں جب ہم کسی دوست کی کامیابی کو دیکھتے ہیں، اُس کو شادمان دیکھتے ہیں، اُس کو خوشحال دیکھتے ہیں، اُس کی ترقّی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں بیحد خوشی ہوتی ہے۔ جب ہم قیامت کے دن مومنین کو اور جملہ احباب کو، اپنے عزیزوں کو کامیاب اور شادمان دیکھیں گے اور اپنے آپ کو کامیاب دیکھیں گے، تو یہ لازمی بات ہے کہ ہماری خوشی میں بہت اضافہ ہو جائے گا۔ دُنیا میں اگر کوئی شخص کامیاب ہے، اُس کے رشتے دار کامیاب نہیں ہے، اُس کی آل یا اولاد کامیاب نہیں ہے، اُس کے محلے والے کامیاب نہیں ہیں اور وہ مومن اچھا ہے، بااخلاق ہے، ہمدرد ہے، مخلص ہے تو کیا اُس کو مزہ آتا ہے؟ نہیں مزہ آتا ہے۔ اِس لئے بہشت کی گوناگون خوشیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہاں پر ہم، ہم اپنے ہم خیال افراد کو یعنی مومنین کو، ہم مذہب والوں کو اور ہم نظریہ والوں کو اور اپنے دوستوں کو، عزیزوں کو بہت کامیاب دیکھیں گے وہ نورانیت سے بھرپور ہوں گے۔ اِنہی معنوں میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن مومنین ایک دوسرے کو دیکھ کے بہت خوش ہو جائیں گے، تو یہاں پر یہ اشارہ ہے کہ ایوب علیہ السّلام کو خداوندِ عالم نے جو انعام فرمایا، جو مہربانی کی، وہ صرف اُنہی کی ذات کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ عقل و دانش والوں کے لئے اِس میں نصیحت ہے یعنی اُن کے لئے بھی یہ رحمت ہوگی، اُن کے لئے بھی یہ مہربانی ہوگی۔

''وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِّعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ''

(۳۸:۴۴)۔کہتے ہیں کہ جس زمانے میں ایوب علیہ السّلام بیمار تھے،تو اُن کے پاس کھانے کے لئے کوئی چیز نہیں رہی تھی۔اُن کی بیوی بہت ہی پاک دامن اور بہت ہی پرہیزگار،متّقی تھی،تو وہ دریوزہ کرنے کے لئے نکلیں، بھیک مانگنے کے لئے۔میں پہلے قصّہ بتاتا ہوں، پھر اُس کے بعد تاویل، اِدھر اُدھر اُنہوں نے پوچھا اور اِمداد کے لئے دستِ سوال کو پھیلایا تو کسی نے تعاون نہیں کیا،کسی نے مدد نہیں کی،کسی نے یاری نہیں کی،کسی کو رحم نہیں آیا تو اتنے میں کرتے کرتے ایک کافر کے گھر میں آئی،تو کافر تھا،بڑا ضدّی تھا،بڑا دشمن،اُس نے کہا کہ اچھا آپ کو جو کچھ کھانے پینے کی چیزیں چاہئیں اِس کے لئے آپ اپنے بالوں کو کاٹ کے ہمیں دے دیں،اپنے بالوں کو فروخت کریں،تو ہم آپ کو دے دیں گے۔اُن کے عظیم شوہر کی قربانی کے لئے،اُن کے نظریے میں اور اُن کے نزدیک اُن کے بالوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی،لہٰذا اُنہوں نے اپنے بالوں کو کاٹ کے اُس کافر کے ہاتھ میں فروخت کر دیا اور کافر نے اُن کو آٹا وغیرہ دے دیا۔کہتے ہیں روایت یا کہانی کے مطابق تو جونہی وہ نیک خاتون اُس گھر سے نکل رہی تھیں تو اتنے میں شیطان بڑی عجلت کے ساتھ پیغمبر کے حضور میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ دیکھو تمہاری بیوی نے کوئی چوری کی ہے،کوئی فعلِ بد کیا ہے لہٰذا اُس کے بال کاٹے گئے ہیں۔اب بیماری ایک طرف اور یہ بدخبر دوسری طرف،اُس کو بہت دُکھ ہوا،بہت تکلیف ہوئی تو اُنہوں نے کسی تاخیر کے بغیر قسم کھائی کہ جب یہ ٹھیک ہو جائیں گے،تو اُن کے سو دُرّے لگائیں گے،قسم کھائی۔پھر وہ نیک بی بی آئی اور وہ چیزیں لائیں تو بہت کچھ رُوٹھا اور بہت کچھ کھانے سے انکار کیا،ہر چند کہ اُنہوں نے اصرار لیکن نہیں مان رہے تھے۔آخر کار مختصر قصّہ یہ ہے کہ جب وہ صحت یاب ہو گئے تو اُن کے دل میں آیا کہ اپنی بیوی کو سو دُرّے لگانے ہیں،تو خداوندِ عالم نے ارشاد فرمایا کہ آپ کی بیوی بڑی نیک ہے،وہ پاک ہے،وہ ہر عیب سے بَری ہے تو یہ شیطان کی تہمت تھی لیکن آپ نے جو قسم کھائی ہے اُس کو پورا کرنے کے لئے جھاڑو ہاتھ میں لیجئے اور ایک بار جھاڑو سے اُن کو ماریئے تو جھاڑو میں بہت سارے تنکے ہیں،بہت ساری تیلیاں ہیں تو اِسی کے ساتھ آپ کی قسم کا جو تقاضا ہے وہ پورا ہو جائے گا۔

روایت،روایت ہی ہوتی ہے،کہانی کے طور پر ہوتی ہے لیکن اصل جو بات ہوتی ہے وہ رُوحانیت میں ہوتی ہے۔ رُوحانیت میں یہ بات ہے،ایسا لگتا ہے کہ حضرت ایوبؑ نے اپنی بیوی کو جھاڑو سے نہیں مارا بلکہ ہر بڑے اور چھوٹے انسان کے اندر نفس ہے،اُس نفس کے لئے کچھ تہدید،کچھ ادب اور کچھ سکھانے کی بات تھی تو اُنہوں نے اِس نفس کو جھاڑو سے مارا اور نفس کو جھاڑو سے مارنے کی آخری تاویل یہ ہے کہ اُن رُوحوں کی بہت سی مثالیں ہیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا اور ایک مثال یہ ہے کہ اُن کی تشبیہہ جھاڑو سے دی گئی ہے یہاں،کہ جھاڑو کے اندر بہت ساری تیلیاں ہوتی ہیں، بہت سارے تنکے ہوتے ہیں۔خداوندِ عالم اپنے قانون میں یہ کہتا ہے کہ میں تم کو عذاب دوں گا اور میں تم کو یہ سزا دوں گا اور ملائکہ تم کو ماریں گے،پیٹیں گے وغیرہ۔پھر دوسری طرف سے یہ بھی فرماتا ہے کہ میری حکمت ہے میں اپنی اِس بات کو

بھی پوری کروں گا اور تمہیں سہولت بھی دے دوں گا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بظاہر خداوند خود یہ سکھاتا ہے، ایسا سکھاتا ہے، کہ اِس میں جو قسم ہے وہ بھی اپنی جگہ پر صحیح رہے اور اُن کو سہولت بھی ہو، اُن کو تکلیف بھی نہ ہو۔ اِسی آیت میں حضرت ایوبؑ کے صبر کی تعریف کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ وہ خداوند کا ایک اچھا بندہ تھا اور رُجوع کرنے والا تھا۔ اِس کے بعد فرمایا گیا ہے:

''وَاذْكُرْ عِبَادَنَآ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْحَاقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِى الْاَيْدِىْ وَالْاَبْصَارِ''(۳۸:۴۵)۔ اِن چند عظیم پیغمبروں کا ایک ساتھ ذکر ہے جیسے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور اُن کے متعلق خداوند فرماتا ہے کہ وہ ہاتھوں والے اور آنکھوں والے تھے۔ دیکھئے کہ ہاتھوں والے اور آنکھوں والے تو سب ہی ہوتے ہیں، دُنیا میں جو بھی انسان ہوتا ہے تو اُس کے ہاتھ ہوتے ہیں، اُس کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ اگر اِس میں تاویل نہ ہو تو یہ ایک عام بات بن جائے گی، لیکن نہیں! اِس میں حکمت ہے، تاویل ہے، وہ یہ کہ ہاتھ سے مراد رسائی ہے، (approach) ہے اور اُس کا ایک خاص مقام ہے، اُس کی ایک حد ہے۔ سب سے بلند ترین مقام مرکزِ عقل ہے، وہاں پر خزانے ہیں، وہاں پر جواہرات ہیں تو جن عظیم انسانوں کا ہاتھ وہاں تک پہنچتا ہے، تو اُن کو ہاتھ والے قرار دیا جاتا ہے اور آنکھ والے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اِس آنکھ سے یہ آنکھ مراد نہیں ہے، اِس آنکھ میں تو حیوان بھی شریک ہے، حیوان بھی اپنے چلنے کا راستہ دیکھتا ہے، انسان بھی دیکھتا ہے اور جانور بھی اپنی غذا کو پہچانتا ہے، اِس کی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن آنکھ والے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آنکھ کو کیا دیکھنا چاہیئے؟ عقلی دُنیا کو دیکھنا چاہیئے اور جہاں پر خزانے ہیں اور جہاں پر جواہرات ہیں اور جہاں پر دیدار ہے اور جس مقام پر لامکان ہے اور جس حد میں بہشت ہے اور عرش ہے اور سب سے بڑا دیدار ہے، یہ چیزیں جو حضرات دیکھتے ہیں اُن کو کہا جاتا ہے آنکھ والے۔ ویسے دُنیا میں کسی بھی زبان میں اور مختلف زبانوں میں، تقریباً ہر زبان میں ایسے بہت سے محاورے ہوتے ہیں، ایسی بہت سی مثالیں ہوتی ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ وہ آنکھ والا ہے، بصیرت والا ہے، وہ دیکھتا ہے، میں دیکھتا ہوں، یوں کہا جاتا ہے تو اِس سے وہ عام آنکھ مراد نہیں ہوتی ہے، اِس آنکھ کے اندر ایک اور آنکھ مراد ہوتی ہے، تو اِن حضرات کو ہاتھوں والے اور آنکھوں والے کہنا کا مطلب یہ تھا جو بیان ہوا۔

''اِنَّآ اَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ''(۳۸:۴۶)۔ اِن حضرات کی مزید تعریف فرماتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ ہم نے اُن کو آخرت کے گھر کی یاد کے لئے مخصوص کیا تھا۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کو یاد کرنا جو ہے بہت بڑی بات ہے اور خداوند عالم اِس کام کے لئے بہت سے حضرات کو برگزیدہ فرماتا ہے، منتخب فرماتا ہے۔ ''وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ''(۳۸:۴۷)۔ اور یہ انبیاء ہمارے نزدیک برگزیدہ افراد میں سے تھے، برگزیدہ اور چنے ہوئے افراد میں سے تھے۔ ''وَاذْكُرْ اِسْمَاعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ''(۳۸:۴۸)۔ اے رسولِ کریم آپ اسماعیل کو بھی اپنی رُوحانیت کے واقعات میں، اپنی رُوحانیت کی کتاب میں یاد

کیجئے اور ''الْیَسَعَ'' کو بھی اور ''ذَا الْکِفْلِ'' کو اور یہ سب خدا کے منتخب بندوں میں سے تھے،

''ھٰذَا ذِکْرٌ'' (۳۸:۴۹) یہ نصیحت ہے۔ ''وَاِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ'' (۳۸:۴۹) بیشک پرہیزگاروں کے لئے ایک اچھا ٹھکانا ہے۔ قرآن کی یہ عادت رہی ہے کہ حضراتِ انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد مومنین کو بھی اُن سے ملانے کے لئے آیت کے آخر میں ایک عام رحمت کی بات ہوتی ہے، کسی بھی لفظ میں، کسی بھی اصطلاح میں مومنین کو اُن حضرات سے ملا دیا جاتا ہے اور اُس رحمت کو سب مومنین کے لئے مشترک قرار دی جاتی ہے اور یہاں پر متقین کے لفظ میں یہ بات ہوئی اور قرآن میں متقین کا جو لفظ ہے وہ بہت بڑا لفظ ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہوں اور یہ بتا کر خوش بھی ہو جاؤں گا، یہ کہ قرآن میں کچھ نام ہیں جن میں پیغمبر، امام اور مومن آپس میں مل سکتے ہیں۔ لفظِ پیغمبر ہے، اُس میں (direct) کوئی مومن نہیں مل سکتا ہے، اُس میں بھی ملنے کے طریقے ہیں لیکن (direct) نہیں اور لفظِ امام میں بھی (direct) نہیں اور لفظِ متقین ہے یا مومنین ہے اور اِس جیسے الفاظ ہیں، نام ہیں، یہ (common) ہیں اور مشترک ہیں یعنی انبیاء، ائمہ اور مومنین کے لئے متقین (common) ہے۔ پھر بھی درجات اپنی جگہ پر صحیح ہیں، پیغمبر کا درجہ پیغمبری کا ہے، امام کا درجہ امامت کا ہے، مومن کا درجہ اُس سے نیچے ہے، پھر بھی سب بہشت میں ہیں۔ خدا کی رحمت سے اور پیغمبر کے توسّط سے، امام کے وسیلے سے۔ خدا کی ایک ہی صراطِ مستقیم ہے اُس پر آپ دیکھیں نظریاتی طور پر، تصوراتی طور پر دیکھیں، آگے آگے انبیاء ہیں، اُن کے پیچھے پیچھے ائمہ ہیں، اُن کے پیچھے پیچھے مومنین اپنے درجات کے مطابق چل رہے ہیں، آخر کہاں جانا ہے اِن کو؟ رستے میں تو ایک دوسرے کے پیچھے ہیں، جب منزلِ مقصود آئے گی تو سب ایک ہی جگہ پر بیٹھیں گے۔ عجب نہیں کہ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ جائیں تو یہ متقین ایک مشترک نام ہے۔

''جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ'' (۳۸:۵۰)۔ ہمیشہ کی بہشت ہے یا ہمیشہ کی بہشتیں ہیں جن کے دروازے اِن کے لئے کھلے ہیں۔ دُنیا میں اور آخرت میں کافر کے لئے بہشت کا دروازہ بند ہے پر مومن کے لئے بہشت کا دروازہ کشادہ ہے۔ بہشت امام ہے، بہشت امام کا علم ہے، بہشت امام کا دیا ہوا تصور ہے، بہشت امام کی بتائی ہوئی عبادت ہے، بہشت وہ جگہ ہے جہاں عبادت کے لئے امام نے فرمایا ہے۔ بہشت کوئی ایک چیز تو نہیں ہے نا! بہشت کے بہت سے اجزاء ہیں، بہشت ایک وسیع چیز ہے، بہشت اِس ساری کائنات کے برابر ہے۔ لہٰذا اِس بہشت میں بہت ساری چیزیں ہیں، اِس کی بہت سی شکلیں ہیں پر جو بہشت کا مرکز ہے وہ امام ہے اور بہشت کی کلید جو ہے وہ امام کے ہاتھ میں ہے، تو اِنہی معنوں میں بہشت کے دروازے مومنین کے لئے کشادہ ہیں، دُنیا میں جزوی طور پر اور آخرت میں کُلی طور پر، یہ فرق ہے۔ چونکہ ہم اِس دُنیا میں رہتے ہیں تو بہشت کا جو کُلی مزہ ہے وہ ہم کو نہیں آئے گا، وجہ اِس کی ہماری اِس جسمانی ہستی سے جو رُکاوٹ پیدا ہوتی ہے وہ وجہ ہے، ہم اِس دُنیا میں رہتے ہیں دوسروں کے ساتھ رہتے ہیں،

(disturbance) ہے اور جسم ایک مسئلہ ہے، نفس ایک مسئلہ ہے لہٰذا امام کا علم اگر بہشت ہے، تو اِس سے ہم کو بھرپور مزہ نہیں آئے گا، مزہ آئے گا دوسری دُنیا کی بہت ساری نعمتوں سے بڑھ کر اِس سے ہم کو مزہ ملے گا، لذّت ملے گی لیکن کُلّی طور پر اِس کا مزہ وہاں ہوگا جب ہم اِس خول کو پھینک دیں گے۔ جس طرح آپ نے سُنا ہے کہ ریشم کا کیڑا پروانہ بن جاتا ہے، تو پہلے رینگتا تھا، اُس کے بعد پرواز کرتا ہے، ہم بھی ایسے ہیں، اب کیڑے ہیں، جب ہم میں پرواز کے لئے معرفت کے، علم کے پَر لگیں گے، ذکر کے پَر لگیں گے تو ہم بہشت کی فضاؤں میں پرواز کریں گے، تو تب بہشت کی لذّتوں اور نعمتوں کا مزہ ملے گا، تو یہ بہشت کے دروازے کھلے ہیں، اِس کی وضاحت ہو رہی ہے۔ بہشت کی دروازے کھلے ہیں، اِس کی ایک خاص تاویل یہ بھی ہے کہ آپ جب قرآن کو پڑھیں گے یا قرآن پر غور کریں گے یا قرآن کے علم کو سُنیں گے تو آپ کے لئے اِس میں سے بہشت کی نعمتیں ملیں گی لیکن دوسروں کو تھوڑی ملیں گی، اُن کے لئے دروازے بند ہیں، آپ کے لئے دروازہ کشادہ ہے۔ آپ کوئی بھی سوچیں گے علمی سوچ میں گہرائی میں جائیں گے، کسی مسئلے کو حل کرنا چاہیں گے، کسی علم تک رَسائی کرنا چاہیں گے، کسی دیدار تک جانا چاہیں گے، عبادت میں کامیابی چاہیں گے، عبادت سے مسرت وشادمانی چاہیں گے آپ کے لئے بہشت کے دروازے کھلے ہیں، بند نہیں ہیں اور بہشت کے دروازے پر آپ کے لئے کوئی تالا نہیں ہے، کوئی دروازہ بند نہیں ہے۔

آپ کے لئے بالکل، بیشک آپ بہشت سے باہر ہیں لیکن آپ کے لئے دروازہ کھلا ہے۔ آپ جاسکتے ہیں، جب بھی چاہیں، جس طرح چاہیں، آج چاہیں، کل چاہیں تو آپ جاسکتے ہیں، تو یہ یعنی مومنین کے لئے ہے اور دوسروں کے لئے جو حالت ہے اِس کے برعکس ہے، اُن کے لئے مقفّل دروازے ہیں، تالے لگے ہوئے ہیں۔ جس طرح قرآن کے متعلق ایک آیت ہے کہ کیا وہ لوگ قرآن میں غور وخوص نہیں کرتے ہیں، غور وفکر نہیں کرتے ہیں، اِس کی کیا وجہ ہے؟ پھر خداوند فرماتا ہے اِس کی دو وجہیں ہیں یا تو وہ غور نہیں کرتے ہیں، یا وہ اُن لوگوں میں سے ہیں جن کے لئے، جن کے دلوں پر قرآن کے تالے لگے ہوئے ہیں (۴۷:۲۴) قرآن میں نہیں ہے، قرآن میں کوئی تالا نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کی نظر سے گرے ہوئے ہیں، جن لوگوں کو نافرمان کہنا چاہیئے اُن کے دلوں پر قرآن کے تالے لگے ہوئے ہیں، قرآن میں نہیں، تو قرآن میں نہ جاسکنے کے دو اسباب ہیں، ایک یہ کہ کوئی مومن ہے، وہ جاسکتا تھا لیکن کوشش نہیں کرتا ہے، غور نہیں کرتا ہے، طلب نہیں کرتا ہے، آگے نہیں بڑھتا ہے، وہ نہیں جاسکے گا، وہ اپنی وجہ سے اور دوسرا وہ شخص قرآن میں نہیں جاسکے گا جس کے دل پر قرآن کا تالا لگا ہوا ہے۔ اِسی طرح یہ بہشت کی بات ہے کہ بہشت کے دروازے مومنین کے لئے کشادہ ہیں۔

''مُتَّكِئِيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ'' (۳۸:۵۱)۔ مومنین بہشت میں تکیہ کئے ہوئے ہوں گے اور وہاں بہشت کے خادموں کے ذریعے سے میوے طلب کئے جائیں گے اور پینے کی چیزیں طلب

کی جائیں گی۔سب سے پہلے ''مُتَّکِئِیْنَ ''تکیہ لگانے میں کیا حکمت ہے؟ بظاہر تکیہ لگانا یوں ہے جیسے آپ دیوار کے ساتھ یا کسی تکیہ کے ساتھ تکیہ لگائے ہیں، ٹیک لگائے ہیں اور رُوحانیت میں تکیہ لگانا یوں ہے کہ مومنین بڑی بڑی رُوحوں کے ساتھ ہوں گے اور اُن کا سہارا اُن بڑی رُوحوں سے ملے گا، انبیاء اور ائمّہ حضرات کے ساتھ ہوں گے اور اِن کی انا کی وابستگی ہو گی کسی بڑی انا کے ساتھ۔اُس کو آپ اپنی انا کہئے یا کوئی عظیم رُوح کہئے، امام مانیے، خدا کہئے، پیغمبر کہئے تو مزہ اُس میں ہے کہ ایک طرح سے (unity) ہے اور دوسری طرف سے (dualty) ہے یعنی دوئی بھی ہے اور وحدت بھی ہے۔دیکھیں کہ خدا اہمیت دیتا ہے، انسان کے ہاتھ میں دو چیزوں کے لئے اہمیت دیتا ہے اور اپنے لئے ایک چیز کو منتخب کرتا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ تو کثرت اور وحدت دونوں سے برتر ہے اور انسان میں دو چیزیں ہیں، اِس میں وحدت بھی ہے اور کثرت بھی ہے یعنی (unity) بھی ہے اور (disunity) بھی ہے۔آپ ایک جگہ کو، ایک چیز کو لینے کے بجائے دو چیزوں کو لیں، ایک خزانے کے بجائے دو خزانوں کو لیں، تو بہشت میں تکیہ لگانے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری اپنی انا قائم ہو گی اور ایک اُوپر کی انا بھی ہو گی۔یہ جو انائے سفلی ہے وہ انائے علوی کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئی ہو گی، اُس کے سہارے پر ہو گی تو وہ اِس کو ہر وقت علم، حکمت اور ہر چیز بتائے گی تو تکیہ لگانے کی تاویل یہ ہے اور یعنی میووں کو طلب کرنا اور منگوانا، میوہ کی تاویل علم ہے اور رُوح ہے۔۔۔۔۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: مہر انگیز عظیم　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　پُروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ ص

کیسٹ نمبر: Q-46-B	تاریخ: ۲۷؍ جنوری؍ ۱۹۸۴ء کراچی

Click here for Audio

انسان کی مثالیں اِس کائنات کی ہر چیز سے دی جائے تو پھر بھی کم ہے مثلاً انسان سورج کی طرح ہے، انسان چاند کی طرح ہے، انسان ستاروں کی طرح ہے، انسان فضا کی طرح ہے، انسان سمندر کی طرح ہے، انسان زمین کی طرح ہے، انسان درخت کی طرح ہے، انسان جھاڑ کی طرح ہے، نباتات کی طرح ہے، وغیرہ، تو اِن تمام مثالوں میں سے ہم درخت کی مثال لیتے ہیں۔ انسان ایک درخت ہے اِس شخصیت کو دیکھا جائے تو لیکن اس میں سے جو اچھی رُوح پیدا ہوتی ہے، ایمان کی رُوح وہ اِس کا پھول ہے اور اِس میں سے جو رُوحِ قدّوس بنتی ہے، رُوحِ قدسی بنتی ہے وہ پھل ہے اور اُس میں سے جو معرفت حاصل ہوتی ہے وہ مغز ہے اور معرفت کا جو نتیجہ ہے وہ جوہر ہے۔ بالکل انسان ایک درخت کی طرح ہے اِس کا فلسفہ، اور اِس کے علاوہ دُنیا کی ہر چیز جو ہے ایک پھل رکھتا ہے، ہر چیز کا علم اُس چیز کا پھل ہے۔ اگر پتھر ہے اُس میں سے آپ ایک علم کو اخذ کرتے ہیں، تو وہ علم جو آپ نے اُس پتھر سے حاصل کیا، اُس کی (study) کرتے ہوئے وہ اُس پتھر کا پھل ہے اور اِس طرح جانوروں میں (study) کرتے ہوئے جو آپ علم پاتے ہیں وہ بھی پھل ہے اور پھل سے مراد نتیجہ، اور پھل سے مراد (results) تو آپ اِس پوری کائنات کی ہر ایک چیز سے ایک (result) کو اپنی (study) کے دوران حاصل کرتے ہیں، تو بہشت کے پھلوں کی تاویل یہ ہے۔

مِن جملہ بہشت کے پھل تین قسم کے ہوں گے، سب سے اُوپر کے جو پھل ہوں گے وہ عقلی ہوں گے، علمی ہوں گے اور دوسرے درجے کے پھل جو ہوں گے وہ رُوحانی ہوں گے۔ اِس کے بعد نچلے درجے کے جو پھل ہوں گے وہ جسمانی ہوں گے، پھر آپ شاید سوال اُٹھانا چاہیں گے کہ کیا اگر بہشت میں پھل جسمانی ہیں، تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اِس طرح غذائیں کھائیں گے جس طرح دُنیا میں کھاتے ہیں؟ نہیں، اِس میں فرق ہے، یہ کہ بہشت میں آپ کی جو ہستی ہوگی، آپ کا جو وجود ہوگا وہ تین (elements) پر مبنی ہوگا، وہ تین اجزاء پر مشتمل ہوگا، تین اجزاء پر مشتمل ہوگا، عقل، رُوح اور لطیف جسم۔ لطیف جسم بھی ضروری ہے، یہ نہ ہو تو پھر بہشت کی مکمل لذّتیں، نعمتیں آپ کو حاصل نہیں ہوسکتی ہیں۔ جس طرح یہاں پر انسان تین چیزوں پر مبنی ہے، اِس کی ایک چھوٹی سی عقل ہے، ایک چھوٹی سی رُوح ہے، ایک محدود، مکدّر سا، کثیف سا

بدن ہے، اِس کی (existence) یہاں اِس دُنیا میں یوں ہے اور قیامت میں اِسی طرح یہ چیزیں ہوں گی مگر پاک اور صاف ہوگی کہ عقل کامل اور مکمل ہوگی اور رُوح بہت پاک اور پَوِتر ہوگی اور جو بدن ہے یہ ایک نورانی بدن ہوگا، اِس کو جسمِ لطیف کہا جاتا ہے اور اِس کے کئی نام ہیں، سائنس میں اور مذہب میں اِس کے کئی نام ہیں تو وہ لطیف نورانی بدن ہوگا جو یعنی ذرّاتِ لطیف پر مبنی ہوگا، اُس میں کوئی خون نہیں ہوگا اور سانس نہیں ہوگا، رُطوبت نہیں ہوگی، بیماری نہیں ہوگی اور اُس بدن کی خوراک (gases) کی صورت میں خوشبوئیں ہوں گی، وہ جسمانی غذائیں کہلائیں گی، خوشبوئیں اور ہر قسم کی خوشبوئیں اور وہ غذا چبانے کی نہیں ہوگی، صرف سونگھنے کی ہوگی اور اِس کو غذائے جلالی کہا جاتا ہے اور جو لوگ اِس دُنیا میں اعلیٰ پیمانے پر رُوحانیت میں کامیاب ہوجاتے ہیں، تو اُن کو کورس کے طور پر، تجربے کے طور پر، مشاہدے کے طور پر اور معرفت کے طور پر یہ تمام چیزیں دکھائی جاتی ہیں، اور انبیاء، ائمّہ، پیر اور اِس طرح سے کامیاب مومنین جو راہِ رُوحانیت پر آگے بڑھتے ہیں، اِن کو اِس چیز کا تجربہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اِس کا تجربہ، ایک بار دیکھنا لازمی ہوتا ہے تاکہ دین میں جو کچھ نعمت ہے، امام کی جو کچھ رحمت ہے اُس کا کچھ اندازہ کیا جائے اور شناخت ہو، علم ہو۔ اگر بہشت کی کچھ کچھ لذّتیں، نمونے، مثالیں اِس دُنیا میں نہیں ہوتیں تو پھر ہم اِس دُنیا سے اندھے جاتے حالانکہ یہ بات نہیں ہے، اور سورۂ محمد میں آپ دیکھتے ہیں کہ خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ بہشت وہ ہے جس کا تعارف مومنین سے دُنیا میں کرایا گیا تھا (۴۷:۶)۔

یہاں پر میرے (notice) میں ایک سوال پیدا ہوا ہے، تو مومن اندھا نہیں ہے، مومن بہت بڑی بصیرت رکھتا ہے، بہت بڑا دانا ہے ہر مومن۔ وہ اُس کی دانائی اِس بات میں ہے، کہ اُس نے دُنیا میں جس دوست کا انتخاب کیا ہے وہ دوست بے مثال ہے، اِس میں مومن کی سب سے بڑی دُور اندیشی ہے، دُور بینی ہے، دانائی ہے، بصیرت ہے، عقل کا ثبوت ہے اور یہ، اور وہ دوست جو دانا ہے، جس کا مومن نے انتخاب کیا ہے، خدا اور رسولؐ کی ہدایت کے مطابق اور خدا اور رسولؐ کی بتائی ہوئی راہ پر چلتے ہوئے، وہ امام ہے اور جس نے امام کے مقدّس دامن کو تھام رکھا ہے، وہ نادان نہیں ہے، وہ جاہل نہیں ہے، وہ اندھا نہیں ہے، وہ بڑا ہوشمند ہے، وہ بڑا خوش نصیب ہے۔ جاہل وہ ہے جس کو پیغمبر نے جاہل کہا، کہاں ہے وہ حدیث جس میں مومن کی تعریف کی گئی اور غیر کی مذمّت کی گئی؟ وہ حدیث یہ ہے: ''مَنْ مَاتَ وَ لَمْ یَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِهٖ مَاتَ مِیْتَةً جَاهِلِیَّةً وَ الْجَاهِلُ فِی النَّارِ'' اِس حدیث نے ایک دم سے جہالت کو مومنین سے اُٹھا کے غیر مومنین کی طرف پھینک دیا، اُس طرف کر دیا اور مومنین کو جہالت و نادانی سے بَری کر دیا، کس وجہ سے؟ کیونکر؟ اِس لئے کہ وہ امام کو پہچانتے ہیں تو یہ پہچان جو ہے نا! ایک بنیادی علم ہے، ایک بنیادی معرفت ہے۔ اب اِسی میں سے علم کے چشمے پھوٹ رہے ہیں، اِسی سے معرفت کی روشنی پیدا ہو رہی ہے، یہ بنیاد ہے۔ لہٰذا مومن اندھا نہیں ہے، مومن بصیرت رکھتا ہے مومن کی آنکھ ہے، وہ امام کو دیکھتا ہے اور امام بہشت ہے، تو بہشت کو پہچانتا ہے تو کل اِسی امام کی ذات میں بہشت ملے

گی۔ بہشت کی بہت سی مثالیں ہیں۔ بہشت کے طول وعرض کی بات کروں قرآن کے مطابق، کہ وہ اِس پوری کائنات پر پھیلی ہوئی ہے یعنی جتنا عرض کائنات کا ہے، جتنا طول یہ جہان ہے تو یہی طول وعرض جنّت کا ہے اور پھر اِس کے باوجود جنّت کا ایک مرکز ہے اُس کی ایک مخصوص شکل ہے، اُس کی ایک صورت ہے وہ انسانی صورت میں ہے یعنی جنّت کا پھیلاؤ تو اتنا ہے جو میں نے بتایا لیکن اُس کی ایک مخصوص شکل بھی ہے، وہ مجسّم ہے، وہ انسانی شکل میں ہے، انسانِ کامل کی صورت میں ہے، وہ پیغمبر کی صورت میں ہے اور امام کی شکل میں ہے لیکن پیغمبر کی صورت میں ہے تو امام کے توسّط سے پانا ہے۔ لہٰذا مومنین جو ہیں وہ جاہل نہیں ہیں، مومن جو ہے وہ اندھا نہیں ہے۔

اندھے پنے کا ذکر اِس لئے ضروری ہے کہ آیت میں ہے کہ: ''وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا'' (۱۷:۷۲)۔ جو شخص اِس دُنیا میں اندھا رہے اور اپنے آپ میں وہ آنکھ پیدا نہ کرے جس کا پیدا کرنا لازمی ہے تو یہ شخص آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا اور اُس کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ بہت دُور کا گمراہ ہو چکا تھا، تو یہاں چند باتیں قرآن سے بتائی گئیں اور اِسی سے متعلق جو بات ضروری تھی وہ بھی بتائی گئی۔ اب میں چاہوں گا کہ اگر آپ حضرات کا اگر کوئی سوال ہو اِس موضوع سے متعلق یا اِس کے قریب کا تو وہ پوچھا جا سکتا ہے اور شکریہ کہ آپ نے بڑی توجّہ دی۔

سوال: [صدر فتح علی حبیب] سر! آپ نے بہشت میں پاک عقل، پاک رُوح اور جسمِ لطیف کی بات کی۔ اُس میں آپ نے بتایا کہ جسمِ لطیف ہے اُس کی غذا خوشبو کی صورت میں ہے تو رُوح اور عقل کی وہاں پر کیا غذا ہے؟

جواب: ہمارے صدرِ محترم نے جس طرح سے سوال کیا وہ آپ حضرات کے سامنے واضح ہے، بڑا عمدہ سوال ہے اور بہت ہی بنیادی ہے۔ اِنہوں نے انسان کی ہستی جس طرح تین عناصر پر ہے اور جس طرح اُن تین عناصر کی غذائیں جُدا جُدا ہیں اُس کے بارے میں میری گفتگو کے ریفرینس سے کیا اور اِنہوں نے یہ تو مان لیا کہ لطیف جسم کی غذائیں خوشبوؤں کی صورت میں ہے مگر اِنہوں نے یہ سوال پوچھا کہ وہاں پر عقل کی کیا غذا ہے اور رُوح کی کیا غذا ہے؟ تو میں نہایت ہی ادب اور خلوص کے ساتھ عرض کرنا چاہوں گا کہ عقل کی غذا عقلی نوعیت کی ہے اور علم ہے اور حکمت کی باتیں ہیں، خدا کے بھید ہیں اور کائنات کے اسرار ہیں، ازل، ابد اور بقا و فنا سے متعلق جو علم کی چھپی ہوئی باتیں ہیں، اُن کو (discover) کرنا، اُن کا جاننا جو ہے یہ عقل کی خوراک ہے اور یہ عقل کی خوراک بہت ہے۔ جس طرح بعض مثالوں میں مانا جاتا ہے کہ علم لاانتہا ہے، وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا ہے تو یہ ثبوت ہے کہ عقل کی غذا جو ہے بہت زیادہ ہے۔ تاہم یہ بحث الگ ہے کہ آیا علم کبھی ختم ہوتا ہے یا نہیں ہوتا ہے، یہ بحث الگ ہے مگر ہم فی الحال یہ مانیں گے کہ علم کی جو غذا ہے اُس کا ذخیرہ بہت زیادہ ہے، تو خدا کے بھید جن کو عربی میں اَسرار کہتے ہیں یا اِسرار کہتے ہیں، یہ بھید اِن بھیدوں کا جاننا، اُس سے بڑی خوشی ہوتی ہے لیکن سب سے اُوپر کی غذا یہی ہے۔

دوسرے درجے کی غذا جو رُوحانی ہے وہ عبادات ہیں، عبادات، عبادتیں مثلاً صلوات کے پڑھنے میں کیا تاثیر ہے؟ کیسی روشنی ہے یا کس نوعیت کی خوشی ہے،؟ کسی خاص اسم کے پڑھنے سے کیا ہوتا ہے؟ کسی خاص کلمہ کے استعمال سے کیا ہوتا ہے؟ کسی خاص تسبیح میں کیا حکمت ہے؟ تو ایسی چیزیں بھی بہت ہیں، یہ رُوح کی غذا ہے، عبادت، مختلف قسم کی عبادت۔ جس طرح دُنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب ہم جماعت خانے میں عبادت کرتے ہیں، تو ہم کو ایک گُونہ خوشی ملتی ہے، یہ خوشی کیا ہے؟ کس چیز کی خوراک ہے؟ جسم کی؟ نہیں، عقل کی؟ نہیں، پھر کس چیز کی خوراک ہے؟ رُوح کی۔ دیکھیں کہ کوئی بھگت ہے، وہ عبادت کرتا ہے، عبادت کرتا ہے، عبادت کرتا ہے، اُس کی رُوح موٹی ہوتی ہے لیکن عقل موٹی نہیں ہوتی ہے۔ عجیب سی بات ہوتی ہے جیسے کسی شخص کے پاؤں بہت بڑے ہیں یا سر بہت بڑا ہے یا سینہ بہت کشادہ ہے اور نیچے سے نیچے پتلا ہے، یہ ٹھیک نہیں لگتا ہے، تو توازن ہونا چاہئے۔ جتنی عبادت، اُتنا علم۔

جس طرح عام طور پر ہم غذا کو بھی کھاتے ہیں، عبادت کو بھی کرتے ہیں اور غذا کو ترک کریں تو جسم سوکھ جائے گا اور کئی بیماریاں حارِج ہو جائیں گی۔ یہ جسم اور رُوح کے توازن کی بات ہوگئی، (balance) کی بات ہوگئی، اِسی طرح ہماری عقلی خوراک اور رُوحانی خوراک میں بھی (balance) برابر ہونا چاہئے۔ بہت سے مومنین کی رُوحانی ترقّی اِس لئے نہیں ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تسبیح کو توجّہ دیتے ہیں مگر علم کو توجہ قطعاً نہیں دیتے ہیں تو اُن کی ترقّی ایک (level) پر جا کر (stop) ہو جاتی ہے، کیوں؟ آپ پوچھیں، عبادت میں معجزے کی کیا کمی ہے؟ کمی ہے، وہ تو رُوح کی غذا ہے، عقل کی غذا نہیں ہے اور ہمارا دین یہ نہیں بتاتا ہے کہ تم بس عبادت کرو، اور کچھ بھی نہیں سیکھو۔ جتنی اہمیت عبادت کی ہے اُتنی اہمیت علم کی بھی ہے بلکہ علم کی کہیں زیادہ اہمیت ہے۔ عبادت بہت سے لوگ کرتے ہیں، دُنیا میں جس نے مذہب کو قبول کیا وہ عبادت کرتا ہے، یہود بھی عبادت کرتا ہے، نصاریٰ بھی عبادت کرتا ہے، ہندو بہت زیادہ عبادت کرتا ہے لیکن اُس درجے پر وہ کیوں نہیں ہیں جو ایک مسلمان ہے یا خاص کر جو ایک مومن ہے؟ اِس میں ایک علم ہے، اسلام ایک علم ہے، اسماعیلیت ایک علم ہے۔ اِس اسماعیلیت کو قبول کیا، ایک (concept) ہوگیا تو (concept) کی بات جو ہے وہ علم کی بات ہے۔

ابھی جو میں نے کہا کہ مومن کی ایک بہت بڑی دُور اندیشی ہے کہ وہ امام کو مانتا ہے، جب امام کو مانتا ہے تو اندھے پنے سے اُس کو چھٹکارا ملتا ہے، وہ جاہل نہیں کہلاتا ہے، وہ اندھا نہیں کہلاتا ہے، تو اِسی طرح علم کی اہمیت کا یہ ثبوت ہے۔ لہٰذا جب ہم تسبیح سے سکون کو حاصل کرتے ہیں، تو یہ ہماری رُوحانی غذا ہوگئی۔ جب کوئی ہم کو علم دیتا ہے جماعت خانے میں یا جماعت خانے کے باہر یا کسی کتاب سے ہم کو علم ملتا ہے اور اِس علم سے ہم کو سکون ملتا ہے تو یہ سکون کیا ہے؟ یہ سکون عقلی ہے، جس طرح تسبیح میں جو سکون ملا تھا وہ رُوحانی تھا تو یہ سکون جو ہے عقلی ہے۔ لہٰذا اِن دو غذاؤں میں، دو خوراکوں

میں یہ فرق ہے کہ ایک عقلی ہے اور دوسری غذا جو ہے وہ رُوحانی ہے، تو خداوندِ عالم نے اپنی بے پایان رحمت سے اِس طرح تین غذائیں رکھی ہیں اور مومن کو بہشت میں یہ تین غذائیں ملیں گی لیکن سب سے بڑی غذا جو ہے وہ عقلی ہے اور علمی ہے۔ علم اور عقل کا مطلب ایک ہے اور پھر اُس کے بعد رُوحانی غذا ہے۔ ویسے بھی آپ دیکھیں کہ ہماری جو ہستی ہے، ہم ہر حالت میں جسم پر رُوح کو ترجیح دیتے ہیں، ٹھیک؟ اور رُوح پر عقل کو ترجیح دیتے ہیں اور رُوح سے اگر حرکت مراد ہے، تو حرکت بہت سے جانوروں میں ہے۔ رُوح سے مراد یہ ہونی چاہئے کہ ایک پاکیزہ رُوح ہو اور وہ پاکیزہ رُوح ایک ایسے تصور کے تحت ہو سکتی ہے جو کہ وہ سچّے دین کا تصور ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے آپ کے سوال کا جواب مہیا کیا ہے۔

سوال: [امین رحمانی] سر آپ نے اپنے اِس عمدہ لیکچر میں فرمایا تھا کہ بیماری کا تعلق جو ہے وہ شیطان سے ہے، تو یہ بات سمجھ گئے کہ جہالت و نادانی بھی شیطان سے ہے اور عبادت یا رُوح کے مقام پر وسوسے کی جو بیماری ہے وہ بھی شیطان سے ہے۔ کیا جسمانی بیماری میں بھی شیطان کا ہاتھ ہے سر؟ وضاحت فرمادیں۔

جواب: سوال بڑا عمدہ ہے اور بہت ہی منطقی ہے۔ یہ کہ سب سے پہلے میں ہاں بولوں گا اور پھر اُس کے بعد تشریح کرنے لئے کوشش کروں گا کیونکہ قانونِ الٰہی کے مطابق چیزیں جو ہیں وہ دو حصّوں میں تقسیم ہوئی ہیں۔ ایک طرف خیر ہے اور دوسری طرف شر ہے، آپ جب بھی (scholarly) شر کی وضاحت کریں گے اور اُس شر کا تجزیہ کریں گے، (analysis) کریں گے تو اِس شر میں بیماری بھی ملے گی۔ شر ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو ناپسندیدہ ہے، جو اذیّت دینے والی چیز ہے، اور اِس میں بیماری بھی شر ہے۔ لہٰذا جسمانی بیماری بھی شیطان سے ہے، میں یہاں پر اسلام اور شریعت کی ایک مثال دینا چاہوں گا، آنحضرت ﷺ جو خدا کی طرف سے حکیم تھے، جو رُوحانی طبیب تھے اُنہوں نے آج سائنس کی روشنی میں جن چیزوں کو بیماری کا سبب قرار دیتے ہیں اُنہی چیزوں کو رسولؐ شیطان سے منسوب کرتے تھے مثلاً کہتے تھے کہ جب تم کھانے کھاتے ہو تو ہاتھ دھونا اور برتن کو صاف کرنا، گھر کو صاف رکھنا ورنہ شیطان آئے گا، وغیرہ۔ دیکھیں کہ شریعت میں کیا حکمت ہے اور رسولؐ نے جو شریعت بنائی ہے اُس کا پس منظر کیا ہے، تو رسولؐ ہر بیماری کو اور بیماری کے ہر سبب کو شیطان سے منسوب کرتے ہوئے مومنین کو شیطان سے ڈراتے تھے، شیطان کا نام لے لے کر، کہتے تھے کہ دیکھو تم جو صفائی نہیں کرو گے نا! تو اُس وقت تمہارے ساتھ شیطان ہوگا، اِس سے یہ مراد ہوتی تھی کہ تم کو بیماری لگے گی، وغیرہ۔ اِسی زبانِ حکمت سے رسولؐ نے بہت سی مثالوں میں یہ بتایا کہ جو جسمانی بیماری ہے وہ اُس میں شیطان کا ہاتھ ہے مثلاً جراثیم ہی کو لیجئے اور جراثیم پر ذرا بحث کیجئے۔ ڈاکٹر جو بتاتے ہیں وہ سچ بتاتے ہیں اور پیغمبر نے جو بتایا اُنہوں نے بھی سچ بتایا مگر فرق کیا ہے؟ پیغمبر نے صفائی دین کے عنوان سے سکھایا تو مومن نے خدا کے حضور سے ثواب حاصل کرنے کی نیّت سے صفائی کو اختیار کیا تو مومن کو دو چیزیں مل گئیں۔ جو نیّت کی "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" اعمال کا دارومدار نیّت پر ہے، تو اِس

نیّت کی وجہ سے اُس نے صفائی کا جو کام کیا اُس کو ثواب مل گیا۔

اب ڈاکٹر جو ہم کو بتاتے ہیں اور ہم اُس کے بتائے ہوئے احکام پر عمل کرتے ہیں، تو ہم کو ثواب نہیں ملے گا، جسم کی صفائی ہو گی، صحت برقرار رہے گی لہٰذا رسولؐ یہی بات بتاتے تھے اور جراثیم سے کیونکر بیماری ہوتی ہے اور بعض بیماریاں چھوت کی ہوتی ہیں اور بعض بیماریاں جو ہیں یعنی پرہیزگاری کے نہ کرنے سے ہوتی ہیں مثال کے طور پر پُر خوری سے بیماری ہوتی ہے یعنی کھانے میں اعتدال سے کام نہ لے، تو اِس کام کو رسولؐ نے تقویٰ کے عنوان سے سکھایا، اِس بیماری سے اِس طرح سے روکا اور ہوسکتا ہے کہ جو جراثیم ہیں وہ بھی رُوحیں ہوں اور وہ شیطان کے لشکر میں سے ہوں۔ کیونکہ ایک رُوح کا رُوح سے (link) ہے اور سرچشمے صرف دو ہیں، خیر کا سرچشمہ اور شر کا سرچشمہ، تو جراثیم کا بھی کوئی (source) ہونا چاہئے، اِس میں بھی رُوح ہے، کوئی بھی ہے کیسی بھی ہے تو رُوح ہے، تو اِس کا (link) جو ہے شیطان سے ہوسکتا ہے لہٰذا ہمیں جاننا چاہئے کہ جو بیماریاں ہوتی ہیں وہ اکثر و بیشتر شیطان کی وجہ سے ہوتی ہیں اور جہاں پر پیغمبر کے معاملے میں شیطان نے مداخلت کیا، اور قرآن نے صاف صاف بتایا کہ پیغمبر کو جو بیماری ہوئی تھی، گو کہ اُس میں آزمائش تھی، گو کہ اُس میں خدا کی مصلحت تھی، گو کہ اُس میں ایک (demonstration) تھا پھر بھی اُس میں شیطان کا عمل دخل تھا، تو نسبتاً جو عوام ہے، جو ہم ہیں، ہم میں زیادہ شیطان کا تعلق ہوسکتا ہے۔

ایک اور فرمان کی طرف میں اشارہ کرنا چاہوں گا، حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کے ارشادات میں ہے جو صحت سے متعلق ہے کہ اکثر بیماریاں انسان اپنی غلطی سے کرتا ہے[1]، تو میں یہ کہنا چاہوں کہ غلطی کہاں سے ہے؟ غلطی شیطان سے منسوب ہوسکتی ہے، غلطی اِس چیز کا نام ہے کہ ہم نے یعنی خدا کے بتائے ہوئے اُصولوں پر عمل نہیں کیا، امام کی بتائی ہوئی ہدایت سے فائدہ نہیں اُٹھایا، پرہیزگاری نہیں کی، عبادت نہیں کی، صفائی نہیں کی، یہ سب چیزیں دین میں شامل ہیں، لہٰذا شیطان نے ایک بھیس کو اختیار کیا۔

دوسری وجہ میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اسباب جو ہیں وہ ایک سلسلے کی طرح ہیں، زنجیر کی طرح ہیں۔ ایک سبب ہے، اُس کے پیچھے ایک سبب ہے، اُس کے پیچھے ایک اور سبب ہے، اُس کے پیچھے ایک اور سبب ہے یہاں تک کہ جو سب سے بڑا سبب ہے اُس تک یہ اسباب جاتے ہیں، تو بھلائی کے اسباب اور بُرائی کے اسباب، یا خیر کے اسباب اور شر کے اسباب زنجیر کی کڑیوں کی طرح ہیں، تو آج جو تجزیہ ہو چکا ہے اور جہاں تک سائنس کا (approch) ہو چکا ہے اُس میں تو جراثیم کی بات ہے۔ ٹھیک ہے! ہم مانتے ہیں اور اسماعیلی مذہب دوسروں کے مقابلے میں سائنس کو زیادہ قبول کرتا ہے لیکن یہ جراثیم کے پس منظر میں بھی کوئی چیز ہے، اور بہت ساری چیزیں ہیں۔ بہرحال اِس کا (link) شیطان تک پہنچا ہوا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے سوال کا اِس طرح سے جواب دیا گیا۔

سوال: [شاہدہ محی الدین] جب حضرت ایوب علیہ السّلام کی بیوی دریوزہ کے لئے جاتی ہیں تو اُن کو دریوزہ ایک کافر کے گھر سے ملتا ہے اور وہ کافر جو ہے وہ اُن سے اُن کے بالوں کو طلب کرتا ہے تو سر کافر کے گھر سے دریوزہ ملنا اور اُن کا بالوں کو طلب کرنا، اِس کی تاویل کیا ہوگی سر؟

جواب: ویسے یہ روایت ہے اور ہم اِس روایت کو ایک طرف رکھ کے یعنی انسان کے اندر جو نفس ہے اُس پر تاویل کر رہے تھے تاہم اچھے کاموں کی انجام دہی کے لئے کافروں سے بھی چیزیں لینی ہوتی ہیں اور اِس سلسلے میں، میں سمجھتا ہوں کہ زمانۂ نبوّت میں جو کچھ ہوا ہے اُس میں بھی ہمارے لئے ہدایت ہے، کہ یہود و نصاریٰ کے گھروں سے بھی بعض دفعہ تجارت کے طور پر، مدد کے طور پر ایسی چیزیں لی جاتی تھیں، اور یہ تو اِن چیزوں کے لینے کے جواز کی بات ہوگئی تاہم جو رُوحانیت ہے اُس میں کافر جو ہے مومن سے زیادہ قریب ہے بہ نسبت جسمانیت کے، اور مومن کی رُوحانی سلطنت کافر کے بغیر نہیں چلتی ہے گو کہ وہ شر ہے لیکن ردِّعمل کے طور پر. بہت کچھ کام ہوتا ہے، یہاں تک کہ شیطان سے بھی. بہت کچھ کام ہوتا ہے۔ اگر شیطان کے ہونے میں کوئی مصلحت، کوئی حکمت نہیں ہوتی تو خدا اُس کو وُجود ہی نہیں دیتا اور بنیاد ہی سے اُس کو ختم کر کے رکھتا لیکن ردِّعمل یا (reaction) کے طور پر. بہت کچھ اِس میں کام بنتا ہے کافر سے، شیطان سے، شر سے اور شیطان سے. جو ردِّعمل بنتا ہے وہ یہ کہ مومن کا جہاد، مومن کا دشمن سے مقابلہ، مومن کی جنگ، مومن کا استقلال، پامردی اور ایسے. بہت سے اوصاف جو ایک مجاہد میں، جو ایک حقیقی مومن میں ہونے چاہئیں وہ اِس شیطان کے ساتھ مقابلے کرنے سے ہوتا ہے۔

لہٰذا جو کافر ہیں بحیثیتِ مجموعی اُن کافروں سے. بہت ساری قوتیں اور طاقتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور اِس سلسلے کی ایک مثال دُنیائے طبّ میں آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی دَوا، جراثیم کُش نہیں بن سکتی ہے جبکہ اُس دَوا میں زہر کا کوئی عنصر نہ ہو، کوئی بُوٹی کام نہیں آسکتی ہے جبکہ اُس میں تلخی انتہا کو نہیں پہنچ رہی ہو یا اُس میں کھٹاس ہو یا اُس میں شیرینی ہو یا اُس میں ایک قسم کی بُو ہو، تیز بُو ہو، تو ایسی بوٹیوں سے. بہت مفید دوائیاں بناتی ہیں۔ جو بوٹی بالکل سیدھی سادی ہو، اُس میں عام ذائقہ ہو، کچھ خاص بُو نہ ہو، کچھ خاص اُس میں تاثیر نہ ہو، تو اُس سے کوئی دوائی نہیں بنتی ہے۔ لہٰذا خداوندِ عالم نے دو قسم کے حدود بنائے، جحتانِ شب بنائے، جحتانِ روز بنائے تو حضرت یوسف علیہ السّلام کے قصّے میں جائیں، اسماعیلی تاویلات کی کتابوں میں دیکھئے کہ حضرت یوسف علیہ السّلام کے بھائیوں نے اُن سے کیا سلوک کیا؟ بس وہی سلوک کیا جو ایک دشمن اپنے دشمن سے کرتا ہے لیکن وہ حدود میں نظر آتے ہیں، وہ حدود میں نظر آتے ہیں۔ یہی بات ہے نا کہ یوسف علیہ السّلام نے ابتدا میں خواب دیکھا اور یوں خواب دیکھا کہ گیارے ستارے اور سورج اور چاند اُن کے لئے سجدہ کر رہے تھے، تو پھر اِن گیارہ ستاروں سے یوسفؑ کے گیارہ بھائی مراد ہیں اور اُن کو حجتوں میں لیا ہے۔ ہم یہ کہیں گے کہ وہ جحتانِ شب میں سے

ہیں۔کسی مومن کو آگے بڑھانے کے لئے دو ذرائع چاہئیں، خیر کی طرف سے اور شر کی طرف سے، دونوں طرف سے اُس کو (push) چاہئے یعنی اُس کو آگے بڑھانا چاہئے، دھکا دینا چاہئے گاڑی کو چلانے کے لئے، تو لہٰذا کافر جو ہیں وہ مومن سے رُوحانیت میں دُور نہیں ہیں اور کافر جو (negatively) جو کردار ادا کرتے ہیں اُس سے جو مومن کو قوت ملتی ہے۔بہت عجیب ہے۔خدا بار بار اِصرار کرتا ہے قرآن میں اور بار بار یہ کہتا ہے کہ میں ضدّ سے ضدّ کو پیدا کرتا ہوں۔کہتا ہے کہ میں دن سے رات کو اور رات سے دن کو پیدا کرتا ہوں اور کہتا ہے کہ کسی چیز کو جب میں پیدا کرتا ہوں تو اُس چیز کی ضدّ سے پیدا کرتا ہوں یعنی مردے سے زندے کو پیدا کرتا ہوں اور زندے سے اُس مردے کو پیدا کرتا ہوں یعنی مردے کو بناتا ہوں، تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں جاننا چاہئے کہ یہ کفّار زبردستی سے اِس دُنیا میں خود کو وجود نہیں دیا ہے، وجود میں نہیں آئے ہیں بلکہ خدا نے اُن کو اپنی حکمت سے وجود دیا ہے تاکہ وہ ہم کو ستائیں، تاکہ وہ ہم کو تکلیف دیں اور ہم اِس تکلیف میں خدا سے رُجوع کریں اور خدا کے لئے بندہ بن جائیں، عبادت کریں اور اگر یہ بات نہیں ہوتی تو مومن ذرا بھی حرکت نہیں کرتا۔اِس لحاظ سے مومن جو ہے وہ کفّار کے سلوک سے بے نیاز نہیں ہے، کفّار کا اِس کو ستانا چاہئے اور جس طرح آنحضرتؐ کو ابولہب ستاتے تھے اور قریش کے کفّار ستاتے تھے تو اِس میں حکمت تھی تو ہر پیغمبروں کو آپ دیکھیں کہ سب پیغمبروں کو ستایا گیا اور تب وہ پیغمبر ہو گئے۔لہٰذا ایوبؑ کی بیوی نے جو کافروں سے دریوزہ لیا تو اِس میں بھی تاویل ہے اور اپنے بالوں کو بیچا تو ایک ایسی رُوحانیت کافروں کو دی گئی کہ وہ ایک اضافی شئ تھی جس طرح ہم ناخن کو تراشتے ہیں اور بالوں کو مختلف اندازوں سے کاٹتے ہیں تو بال آتے رہتے ہیں، ناخن بھی آتے رہتے ہیں، تو ایک ادنیٰ رُوح ہم سے کافروں کی طرف جاتی رہتی ہے، یہ رُوحِ نباتی ہے، انسان میں تین قسم کی رُوحیں ہیں۔جو درد ہے وہ رُوحِ قدسی میں نہیں ہے یا رُوح نباتی میں نہیں ہے، یہ درمیانی رُوح میں ہے، حیوانی رُوح میں ہے۔ہمارے ناخنوں میں رُوحِ نباتی کے الگ ہونے اور اُس کی کیفیت کیا ہے اُس کا ثبوت کیا ہے۔

ہمارے بالوں میں بھی یہ ہے، تو اگر یہ مانا جائے کہ حضرت ایوبؑ کی بیوی نے کافروں کو اپنے بال دیئے تو مطلب اِس کا یوں ہوگا کہ اُنہوں نے اپنی رُوحِ نباتی میں سے اُن کو دے دیا۔اِس سلسلے کی دوسری بات ہم یہ کرنا چاہیں گے کہ قرآن میں ہے کہ خدا کے خزانے ہیں۔جس طرح کسی مملکت کے خزانے ہوتے ہیں، خدا کے خزانے ہیں اور دُنیا والوں کو جو کچھ ملتا ہے وہ خدا کے خزانے سے ملتا ہے، تو خدا کے خزانے کہاں ہیں اور کیا ہیں؟ خدا کہتا ہے کہ: ''عِنْدَنَا'' (۲۱:۱۵)، ہمارے نزدیک۔سب سے پہلے ہم یہ جانیں گے کہ ''عِنْدَنَا'' کا کیا مطلب؟ یہ جغرافیائی ہے یعنی خدا کے نزدیک کوئی مقامی لحاظ ہے خدا کے نزدیک؟ خدا کسی ملک میں رہتا ہے، کسی (country) میں رہتا ہے کہ وہ خزانے اُس ملک میں ہیں؟ یا خدا کسی سیّارے میں رہتا ہے؟ یا خدا اِس کائنات کے کسی گوشے میں رہتا ہے اور پھر عندنا

نزدیک کا کیا مطلب؟ یہ عند یا نزدیکی یا قربت جو ہے وہ رُوحانی ہے، تو میرے پاس خزانے ہیں کہنے کا مطلب، جو سچے دین میں ہیں وہ خدا کے قریب ہیں، جو سچے دین میں ہیں وہ خدا کے قریب ہیں۔ آپ مومنین خدا کے خزانے ہیں، آپ مومنین خدا کے خزانے ہیں اور دُنیا والوں کو جو رُوحیں تقسیم ہوتی ہیں وہ آپ میں سے ہوتی ہیں، آپ میں سے رُوحیں تقسیم ہوتی ہیں۔ اِسی معنیٰ میں خدا کے خزانے ہیں، لہٰذا حضرت ایوبؑ کی بیوی نے اگر بال دیئے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ کافروں کو اُنہوں نے اپنی رُوحِ نباتی میں سے دیا۔

۱۔ ''اس جسم کی حفاظت احتیاط سے کرنی چاہئے۔ بہت سی بیماریاں اور امراض بالکل قدرتی ہیں اور کسوٹی جیسی ہیں جن سے ہم سب کو گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کم نصیبی سے ایک آدھ قدرتی بیماری یا ناتندرست طبیعت کے مقابلے میں پانچ یا دس بیماریاں تو بے احتیاطی اور حفظانِ صحت کے اُصولوں کی خلاف ورزی کی بدولت پیدا شدہ ہوتی ہیں''، بمبئی، ۷/۱/۱۹۵۱ء

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: مہرانگیز عظیم نظرِ ثانی: اکبر علی پُروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق) کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ صافات کی تاویل

کیسٹ نمبر: Q-47 تاریخ: ۹/ ۲/ ۱۹۸۴ء کراچی

Click here for Audio

آج آپ عزیزوں کے سامنے سورۂ صافات ہے، ہم اِس پورے سورے کو نہیں پڑھ سکتے ہیں اور نہ ترجمہ کر سکتے ہیں، مگر درمیان درمیان سے کچھ حکمتیں عرض کرنے کی تمنا رکھتے ہیں، اِس میں اگر مولا کی یاری ہو دستگیری ہو تو اور اِس پرحکمت سورے کے آغاز میں بہت عجیب حکمتیں ہیں جو رُوحانی دولت سے مالا مال ہیں اور وہ کچھ اِس طرح سے ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ "وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا "(۱:۳۷) خداوندِ عالم قسم کھاتا ہے اُن فرشتوں کی جو صف باندھتے ہیں۔ "فَالزّٰجِرٰتِ زَجۡرًا "(۲:۳۷)، اور اُن فرشتوں کی قسم جو ڈانٹنے والے ہیں۔ "فَالتّٰلِیٰتِ ذِکۡرًا "(۳:۳۷) اور اُن فرشتوں کی قسم جو ذکر کو پڑھتے ہیں، یہ اِن تین آیاتِ کریمہ کا مختصر ترجمہ ہے، اب ہم اِن کی تاویلی وضاحت کے لئے کوشش کرتے ہیں، تو سب سے پہلے خداوندِ حکیم نے صف باندھنے والے فرشتوں کی قسم کھائی اور یہ صف باندھنے والے فرشتے عملی تاویل یا کہ انفرادی رُوحانیت میں اِس طرح سے ہیں، کہ یہ آواز میں، ذکر و تسبیح کی آواز میں، اِن کی صف کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک ہی آواز سے تسبیح پڑھتے ہیں، حمد و ثناء کرتے ہیں اور ذکر سے اِن کی ہم آہنگی ہوتی ہیں اور صف باندھنے کے کئی معنی ہیں۔ اِن میں زیادہ سے زیادہ آواز کی صف آرائی کی بات ہے اور پھر اِس میں وحدانیت کی بات ہے، کیونکہ تمام معنی وحدت میں مدغم ہو جاتے ہیں، اور وحدت ایک ایسا معنیٰ ہے کہ اُس میں سارے معانی ایک ہو چکے ہیں۔ مثلاً بہت سارے فرشتوں کا ایک فرد میں جمع ہو جانا، یہ سب سے بڑی صف آرائی ہے اور اِس کے علاوہ یہ بھی صحیح ہے، کہ بہت سی مثالوں میں فرشتے صف باندھتے ہیں اور صف باندھتے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ رُوحانیت میں بہت ساری مثالیں ہیں، اُن مثالوں میں یہ بھی درست ہے اور اِس کے علاوہ فرشتوں کی صف آرائی کا ذکر قرآن کے کسی اور مقام پر بھی آیا ہے: "وَّجَآءَ رَبُّکَ وَالۡمَلَکُ صَفًّا صَفًّا "(۲۲:۸۹) اور اے رسول آپ کا پروردگار اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے۔

اِس کے بعد "زَجۡر" کی یعنی ڈانٹنے کی بات ہے، تو یہ ایک عنصر ہے رُوحانی آواز کا، اُس میں "زَجۡر" یعنی ڈانٹنے کا پہلو پایا جاتا ہے یعنی جو رُوحانیت کی آواز ہے، جو رُوحوں اور فرشتوں کی آواز ہے، اُس میں کئی عناصر ہیں اور ایک

تو یعنی اُس میں خوش الحانی کا عنصر ہے جو نمایاں ہے، ایک اُس میں ہم آہنگی ہے کہ وہ سب آوازیں ایک ہو جاتی ہیں، اِسی طرح اُس میں ایک ہیبت و جلال کا بھی عنصر ہے، اُسی ہیبت و جلال کے عنصر کا دوسرا نام ''زَجْر'' ہے اور ویسے ''زَجْر'' یعنی کہ (blame) یا کہ ڈانٹ ڈپٹ جو ہے وہ بھی حکمت کے تقاضے کے مطابق اُس مقام پر موجود ہے۔ اُس کے بعد ذکر کی تلاوت کرنے والے فرشتوں کی قسم کھائی گئی ہے اور یہ بہت ہی نمایاں حکمت ہے کہ اُس مقام پر بندۂ مومن سے ذکر و عبادت کو فرشتے اور ارواح لیتی ہیں اور وہی رُوحیں اور فرشتے ذکر کو اور تسبیح کو پڑھتے ہیں، اِس لئے خداوندِ عالم نے اُن کی عظمت و بزرگی کی قسم کھائی ہے۔

اب یہ مقصدِ قسم کیا ہے؟ یعنی قسم کھانے کا مقصد کیا ہے؟ کس بات کی اہمیت کے پیشِ نظر خداوند تعالیٰ قسم کھاتا ہے، وہ اب آتی ہے۔ ''اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ'' (۳۷:۴) بیشک تمہارا پروردگار ایک ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کے متعلق خداوندِ عالم نے تین رُوحانی معجزات کی قسم کھائی یعنی فرشتوں کے تین مراتب کی قسم کھائی یا کہ فرشتوں کے تین گروہ کی قسم کھائی، صف باندھنے والے فرشتوں کی قسم کھائی، ڈانٹنے والے فرشتوں کی قسم کھائی اور ذکر کی تلاوت یعنی بول اور اسمِ اعظم کو پڑھنے والے فرشتوں کی قسم کھائی، اور پھر اُس کے بعد جس بات کی اہمیت تھی اُس کو بیان کیا، اور وہ یہ کہ تمہارا پروردگار ایک ہے، اور یہاں پر ایک بہت باریک نکتہ ہے، یہ جو فرمایا کہ تمہارا پروردگار ایک ہے، اِس میں بہت عظیم حکمت پوشیدہ ہے اور یہ حکمت اتنی عظیم ہے کہ سارے قرآن کا مقصد اِس میں سمویا ہوا ہے۔ کیونکہ پورے دینِ اسلام کا مقصد توحید ہے، اللہ کی وحدانیت اور جتنے انبیاء علیہم السّلام تشریف لائے، اُن سب کا منصوبہ بھی یہی تھا کہ لوگوں کو توحید کا درس دیں، تو وہی توحید کا درس اِس مقام پر نمایاں ہے اور جس کی وجہ سے خداوندِ عالم نے قسم کھائی۔ لیکن ہم اِس کا تھوڑا سا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں، وہ اِس طرح کہ واحد بے شک ایک کو کہا جاتا ہے لیکن جہاں تاویل کے لئے دروازے کشادہ ہیں اور جس طرح اسماعیلی مذہب تاویلی مذہب ہے، اُس کے پیشِ نظر ہم یہاں پر تاویل سے کام لے سکتے ہیں، وہ یہ کہ واحد بروزنِ فاعل اِس میں دو معنی ہیں، اِس میں ویسے تو چھ معنی ہیں لیکن ہم یہاں پر اُن میں سے دو معنی عرض کریں گے کہ واحد فی نفسہٖ ایک کو کہا جاتا ہے اور واحد اُس کو بھی کہا جاتا ہے کہ جو بہت ساروں کو ایک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کیونکہ قرآن جو ''تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ'' (۱۶:۸۹) کا درجہ رکھتا ہے یعنی اِس میں ہر چیز کا ذکر اور ہر چیز کا بیان موجود ہے، اور ہر چیز کا بیان اِس طرح سے ہے کہ ہر لفظ کی ہم تحلیل کریں اور اُس کی حکمت بیان کریں تو اُس صورت میں قرآن جو ہے ہر چیز کو بیان کر سکتا ہے، تو واحد فاعل کے معنی میں بھی ہے یعنی اِس کے معنی ہے فی ذاتہٖ ایک اور پھر ایک کر لینے والا اور ایک کر لینے والے کی مناسبت سے ہم اِس کو مونو ریلزم کا تصور مان سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک امامِ عالی مقام کے قول سے زیادہ مستند کوئی شئ نہیں، اور دنیا میں امامؑ کے ہونے کا مقصد ہی یہی ہے کہ وہ ہم کو نظریات و تصورات اور خاص کر خداشناسی کے مقام میں ظاہراً و

باطناً دستگیری فرمائے۔

چنانچہ حضرت مولانا سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے اپنے ایک ارشادِ گرامی میں فرمایا کہ خدا کا جو تصور ہے وہ مونور یالزم ہے [اسلام میرے مورثوں کا مذہب، صفحہ: ۱۵]۔ اِس کا ترجمہ یک حقیقت ہے یعنی خدا کے مرتبے میں تمام ارواح کی حقیقتیں جمع ہیں، اِسی کے مشابہہ صوفیوں کا ایک نظریہ ہے اور وہ ہے ''ہمہ اُوست''۔ اگر ہم اِس تصور کی وضاحت اپنے طور سے کریں، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام حقیقتیں، خدا خود تمام حقیقتیں ہے یا کہ ساری حقیقتیں خدا میں جمع ہیں یا یوں کہا جائے کہ خدا ایک ایسی حقیقت ہے، کہ جس میں تمام حقیقتوں کی نمائندگی موجود ہے۔ ایک ہوشمند مومن اِس حقیقت کو سمجھ سکتا ہے، وہ یوں کہ جس طرح ہر چیز خدا کے حضور سے یا خدا کے امر سے آئی ہوئی ہے اور اُس میں انتشار پیدا ہوا ہے یا چیزوں میں کثرت پائی جاتی ہے، تو یہ خدا سے دُور ہونے کی بات ہے اور اگر ہم ایسا بھی تصور کریں کہ ساری چیزیں یا ساری حقیقتیں خدا کی طرف رُجوع کر جاتی ہیں، تو اُس میں ہمیں یہ نتیجہ نکالنا ہوگا یا یہ تصور رکھنا ہوگا کہ اُس وقت تمام حقیقتیں یکجا ہو جاتی ہیں، یہ تو ایک مثال ہے، لیکن عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو ذاتِ خدا کوئی ایسی شئ نہیں کہ اُس سے کوئی چیز خارج ہو جاتی ہو، برآمد ہو جاتی ہو یا باہر آتی ہو کیونکہ ذاتِ خدا سے یا نورِ خدا سے کسی چیز کے باہر آنے کی کوئی منطق نہیں بنتی ہے، تو وہ مقام یا وہ مرتبہ ایسا ہے کہ اُس میں جو کچھ ہے یا وہ حال جیسا بھی ہے، وہ ازلی اور ابدی طور پر یکسان ہے یعنی خدا کے نور میں کوئی کمی واقعہ نہیں ہونی چاہئے کسی چیز کے باہر آنے کے نتیجے میں اُس میں خلا پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ دوسری مثال میں وہاں پر اگر کوئی حقیقت ہو یا کوئی رُوح یا کوئی عقل تو اُس کے لئے کوئی ایسا بہانہ نہیں ہوسکتا ہے کہ اُس سے کوئی خطا سرزد ہو اور جس کے جرم میں اُس کو وہاں سے باہر نکال دیا جائے اور یہ بھی نہیں ہوسکتا ہے کہ وہاں پر کوئی حقیقت ہو، کوئی رُوح ہو، کوئی عقل ہو اور اُس کے لئے خدا کے اوصاف میں رہتے ہوئے کسی چیز کی کمی محسوس ہو اور اِس کمی کو پوری کرنے کے لئے وہ دنیا کی طرف آئے، یہ تو صرف ایک مختصر اشارہ ہے، آپ تفصیل سے سوچ سکتے ہیں کہ کسی طرح سے بھی ذاتِ خدا سے کسی چیز کو باہر آنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں! ایک بات ہے، وہ یہ کہ خدا کی حقیقت ایک ایسی حقیقت ہے کہ وہ ایک ہونے کے باوجود سب کچھ ہے، اُس میں سب کی نمائندگی ہے، سب کی انائیں، سب کی حقیقتیں یکجا ہیں اور وہاں سے کچھ سائے ایسے پیدا ہوتے ہیں اُن ساری نمائندگیوں کے سائے آتے ہیں، سو ہم اِس زمین پر اور اِس دنیا میں سایہ ہیں اپنی اُس اعلیٰ حقیقت کے جو ذاتِ خدا میں ہے، جو مونور یالزم کے مقام پر ہے اور چونکہ سایہ کبھی لمبا ہو جاتا ہے کبھی مختصر ہو جاتا ہے، یہ تو ہوتا رہے گا کہ یہ سایہ کبھی اُس حقیقت سے قریب ہو جائے گا کبھی دُور ہوتا رہے گا اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا، تو اِس میں، میں واحد کی تشریح کرتا ہوں کہ واحد ایک ایسا لفظ ہے کہ اُس میں مونور یالزم کا ذکر ہے۔

اِس مقصد کے لئے دو لفظ ہیں ایک احد ہے اور ایک واحد ہے اور قرآن میں سمجھنے کے اعتبار سے سب سے بڑے

لفظ ہیں واحد اور احد، کیوں؟ اِس لئے کہ اِس میں وحدانیت کا سوال اُٹھتا ہے، یہ خدا کی حقیقت کیا ہے اور اُس کی شناخت کیا ہے؟ [یہ] سب سے ابتدائی مسئلہ ہے اور سب سے آخری مسئلہ ہے، تو یہ واحد اور احد کے دو لفظ ہیں۔ ہماری اِس بحث یا اِس نظریئے کی تائید تصوف سے بھی ہوتی ہے کہ اُن کے وہاں ایک اصطلاح ہے صوفیوں کے وہاں، وہ اِس کو واحدیت کہتے ہیں۔ آپ کسی صوفیانہ کتاب کو اُٹھا کر دیکھیں تو آپ کو یہ ایک اصطلاح ملے گی جو واحدیت کی اصطلاح ہے، تو اِس واحدیت کی اصطلاح میں بھی وہ یہی تصور رکھتے ہیں اور اِس کو ''تَعَیُّنات'' کہتے ہیں کہ یہ واحدیت خدا کا وہ مرتبہ ہے جس میں حقیقتوں کا ''تَعَیُّنات'' ہوگیا یعنی مختلف حقیقتوں کا تعیّن ہوگیا، اِس لئے میں آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ قرآن میں جہاں کہیں احد کا لفظ ہے یا واحد کا لفظ ہے، تو اُس کو ہم یک حقیقت مانیں گے یعنی مونو ریالزم۔ اِس لئے کہ ہمارے نامور امام نے ہمارے لئے آسانی پیدا کر دی ہے یا ہماری دستگیری فرمائی ہے، کہ ہم خدا کے مرتبے کو اِس طرح سے سمجھیں، تو لفظ واحد کی اتنی سی وضاحت کرنے کے بعد میں آگے بڑھتا ہوں۔

یہاں پر ایک لفظ ہے ''رَبُّ الْمَشَارِقِ'' [رَّبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ] (۵:۳۷) مشرقوں کا پروردگار۔ مادّی طور پر جب ہم اِس دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو ایک ہی مشرق اور ایک ہی مغرب نظر آتا ہے لیکن اِس مقام پر اور دوسرے مقام پر مشرق اور مغرب جمع کی صورت میں مذکور ہے اور اِس کی تاویل یہ ہے کہ عالمِ عقل میں جہاں عقل کا سورج طلوع ہوجاتا ہے اور غروب ہوجاتا ہے، تو ہر طلوع ایک مشرق ہے اور ہر غروب ایک الگ مغرب ہے، تو اِسی طرح سے مشارق اور مغارب کا تصور صحیح ہے۔ اِس کے بعد ایک نکتہ ہے جو بہت ہی اہم ہے، اور وہ اِس آیت میں ہے، ''اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۨ الْكَوَاكِبِ'' (۶:۳۷)۔ خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے کہ اور ہم نے قریب کے آسمانوں کو ستاروں سے زینت دی۔ جب ہم ظاہری طور پر دیکھتے ہیں تو ستارے قریب کے آسمان پر نہیں ہیں وہ تو علمِ حیات کے جاننے والوں کے بموجب وہ آٹھویں آسمان پر ہیں لیکن یہاں جس طرح سے ارشاد ہوتا ہے وہ یہ ہے، کہ قریب کے آسمان کو خدا نے ستاروں سے زینت دی ہے اور اِس قریب کے آسمان کو ستاروں سے زینت دینے کا مقصد یہ ہے کہ اُن ستاروں کو اور اُس آسمان کو شیاطین کے روکنے کا ذریعہ بنایا ہے، کہ وہ ملاءِ الاعلیٰ کی طرف شیاطین پرواز نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ یہ جو ستارے ہیں وہ اِن شیاطین کو مار بھگانے کے لئے مقرر ہیں، دوسری کسی آیت میں اِن ستاروں کو ''مَصَابِيْحَ'' یعنی چراغ کے نام سے یاد کیا گیا ہے (۵:۶۷) تو یہاں پر اُن چراغوں کو کواکب یعنی ستارے کہا گیا ہے تو قرآن کے نزدیک کواکب اور مصابیح کا مقصد ایک ہے، تو ملاءِ الاعلیٰ سردار فرشتے، وہ خداوندِ عالم کا ایک دربار ہے رُوحانیت میں، اُس میں راز کی باتیں ہوتی ہیں اور شیاطین اُن تک رَسائی کرنے کے لئے کوشش کرتے ہیں اور ہر بار ستارے اُن پر شعلے برسا کر لوٹاتے ہیں، مگر کبھی کبھار وہ شیاطین کسی ایک بات کو چوری کر کے واپس آنے میں کامیاب بھی

ہوجاتے ہیں لیکن پھر بھی شعلے اُن کا پیچھا کرتے ہیں ۔ یہ بات ظاہر میں نہیں بلکہ باطن میں ہے اور ہاں! ظاہر میں کسی دوسرے رنگ میں ہے، تو قریب ترین آسمان، رُوحانیت کا قریب ترین آسمان، امامؑ کی شخصیت ہے، امامؑ کی شخصیت کا ہر فعل، ہر قول ایک ستارہ ہے، ایک چراغ ہے، تو اِن ستاروں کے اور اِن چراغوں کے دو پہلو ہیں، ایک طرف سے اِن چراغوں سے مومنین کے لئے روشنی ملتی ہے اور دوسری طرف سے یہ شیاطین پر شعلے برساتے ہیں ۔ظاہر میں اور باطن میں ملاءُ الاعلیٰ کا مقام امام کی مبارک ہستی ہے، خدا کے بھید اِسی مقام پر پائے جاتے ہیں ۔جو شیاطین نہیں ہیں فرشتے ہیں تو وہ اِن ملاءُ الاعلیٰ کی طرف آگے بڑھتے ہیں اور اُن چراغوں کی روشنی میں ہدایت پاتے ہیں، اِس کے برعکس جو شیاطین ہیں، اُن پر شعلے برستے رہتے ہیں اور جس کے نتیجے میں وہ شیاطین مار بھگائے جاتے ہیں، تو امامؑ کی ہر حرکت، ہر قول، ہر فعل امام کے دشمنوں کے لئے جو شیاطین ہیں، ایک شعلہ ہے کسی بھی طرح سے تقاضا تو یہ ہے کہ وہ امامؑ سے قریب ہو جائیں۔ جو قانونِ خداوندی ہے جو قرآن کی ہدایت ہے جو حدیث کا ارشاد ہے اور جو تلاشِ حقیقت کا تقاضا ہے، اُس کے بموجب خواستہ یا نخواستہ حقیقت کی طرف جاتے جاتے اُن کے سامنے ایک ایسی بات آتی ہے جو کہ اُن کے معیار پر نہیں اُترتی ہے پھر وہ بھاگ جاتے ہیں، اور یہ تو ظاہر میں اِس کا پتہ نہیں چلتا ہے لیکن باطن میں دیکھا جائے، رُوحانیت میں دیکھا جائے تو بالکل واقعاً کچھ روشنیاں ہیں، کچھ روشن چراغ ہیں، کچھ ستارے ہیں اور کچھ شیاطین آسمانِ رُوحانیت کی طرف بلند ہوجانا چاہتے ہیں لیکن وہاں سے ہر بار ناکام ہو کر لوٹ جاتے ہیں ۔ملاء: م،ل،ا۔ یہ سرداروں کا نام ہے اور سردار کا دوسرا مترادف لفظ جو ہے وہ امام ہے، تو امام کی شخصیت میں تمام سابق اَئمہ جمع ہیں، تمام انبیاء جمع ہیں، لہٰذا وہیں پر دربارِ خداوندی ہے ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی اور خدا کے سارے بھید اِسی مقام پر پائے جاتے ہیں، اور جو اِس نور کے دشمن ہیں، اُن کو اِس جانب سے، اِس راستے سے اور اِس آسمانِ عظمت و جلال سے لوٹا دیا جاتا ہے، تو یہ اِس آیت کی تاویل ہے۔

اِس کے بعد آگے بڑھتے ہیں، ایک آیت ہے: ''فَاِنَّمَا هِیَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ'' (۳۷:۱۹)۔ یہ قیامت اور رُوحانیت کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے کہ قیامت کیا ہے؟ رُوحانیت کیا ہے؟ اُس میں ایک سلسلہ ہے، اُس سلسلے میں ایک آواز ہے، اُس آواز کا ایک عنصر ''زَجۡرَ'' ہے تو اِسی سے وہ زندہ ہوجاتے ہیں ۔''فَاِنَّمَا هِیَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ'' میں نے اِس آیت کا انتخاب اِس لئے کیا ہے کہ لفظ واحدہ کی اِس میں وضاحت ہے اور یہ اِس طور سے ہے کہ ترجمہ کرنے والے اِس کو یعنی ایک بار ایک بار اِس کا ترجمہ اِس طرح سے کرتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک ایسا نہیں ہے، یہ ایک سلسلے کو ظاہر کرتا ہے، ایک لمبے سلسلے کو اتحاد کے معنی میں کسی ایک اکائی کے معنی میں نہیں، بلکہ ایک لمبے سلسلے کی (continuity) جو وہ تسلسل ہے، اُس اعتبار سے یہاں پر واحدہ کہا گیا، تاکہ ہم واحد کا جو تصور رکھتے ہیں، اُس کو

سمجھیں۔ بہر حال قرآن میں یہ واحد یا واحدہ کا جو لفظ ہے، کئی آیات میں آیا ہے، اُس کو دیکھیں ملاحظہ کریں، تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ پھر ہم اِس سے بھی آگے بڑھتے ہیں، یہاں پر ایک بہت ہی شاندار آیت ہے، اُس کی ہم ذرا وضاحت کرنا چاہیں گے ''اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ'' (۳۷:۴۱)۔ یہ اہلِ جنّت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے، اہلِ جنّت وہ ہیں جن کو بہشت کا رزق پہلے سے معلوم تھا یعنی پہلے بھی وہ لوگ اِس رزق کو کھا رہے تھے دنیا کی زندگی میں۔ اب اِس کی دو صورتیں ممکن ہیں، ایک تو یہ ممکن ہے کہ دنیا میں جو آسودہ حال ہیں مالی طور سے اور مادّی طور سے اور جسمانی اعتبار سے بہت کچھ اِن کے پاس دولت ہے، اور جسمانی نعمت ہے اور کھانے پینے کی ہر چیز مہیا ہے تو یا تو یہ لوگ مراد ہیں، کیونکہ یہاں رزق کی بات آگئی ہے، تو رزق یا تو ظاہری ہوسکتا ہے یا باطنی، اگر یہ نہیں! جسمانی رزق اِس سے مراد نہیں ہے تو پھر رُوحانی رزق مراد ہوسکتا ہے، اُس صورت میں یہ علم ہوسکتا ہے، یہ حکمت ہوسکتی ہے، یہ بھید ہوسکتے ہیں، یہ خدا کے اسرار ہوسکتے ہیں اور ہاں! یہی صحیح ہیں۔ یہ صحیح اِس لئے ہے کہ اگر ہم فرض کریں کہ اِس سے دنیا کا رزق مراد ہے، تو پھر بہشت کافروں کو ملنی چاہئے کیونکہ آج دنیا میں زیادہ سے زیادہ رزق، روزی، بخت و دولت اُن کے پاس ہے۔ خدا اہلِ بہشت کی نشاندہی کے طور پر فرماتا ہے کہ بہشت میں ایسے لوگ ہوں گے کہ اُنہوں نے بہشت کے رزق کو دنیا کی زندگی میں کھایا ہوگا، اُنہوں نے اِس کو (taste) کیا ہوگا، تو اِس سے آپ نے دیکھا دو متضاد صورتوں کو ہم نے سامنے رکھ کے سوچا، تو نتیجہ اِس کا یہ نکلا کہ یہ مومنین ہیں اور اِس رزق سے عقلی اور رُوحانی نعمت مراد ہے اور اِس کے لئے ضروری ہے کہ اہلِ ایمان دنیا میں بہشت کے رزق کو پہچانیں، اُس کو حاصل کریں جو خدا کی معرفت ہے یعنی امامؑ کی شناخت ہے اور حقیقی علم ہے جو عقلی اور رُوحانی غذائیں ہیں، تو اِس تشریح کے بعد میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ آپ اِس آیت کو اپنے ذہن میں رکھیں ''اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ'' یہ بہت مختصر آیت ہے لیکن بہت ہی جامع ہے۔

''فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ'' (۳۷:۴۲) اُن کے لئے ہر طرح کے پھل مہیا ہوں گے اور وہ معزز ہوں گے یعنی اُن کی عزّت کی جائے گی، وہ بڑے معزز ہوں گے، اُن کو نوازا جائے گا۔ تو ''فَوَاكِه'' ''فَاكِهَا'' کی جمع ہے یعنی پھل، میوے اور میوے کی ہم نے کسی قریبی محفل میں تشریح کی تھی کہ میوہ کسی چیز کا ست ہوتا ہے، کسی چیز کا جوہر ہوتا ہے، کسی چیز کا بہترین حصہ ہوتا ہے۔ درخت کے حساب سے دیکھیں کہ درخت میں کتنے اجزاء ہیں مگر اُس کا بہترین حصہ جو ہے وہ پھل ہے، تو باقی جڑیں ہیں، تنا ہے، چھلکے، شاخیں، پتّے اور بہت ساری چیزیں ہیں، حتیٰ کہ پھول اور کلی بھی اِس میں [ہیں] لیکن دیکھیں کہ ایک لکڑی کے ذائقے میں اور پھل کے ذائقے میں کتنا بڑا فرق پایا جاتا ہے، تو خداوندِ عالم یہ ہمیں سمجھانا چاہتا ہے اِس پھل کی مثال میں کہ اُس کی قدرت کتنی عظیم ہے کہ کاٹھ میں سے ایک ایسی لذیذ اور مقوّی اور غذائیت سے بھرپور چیز کو پیدا کرتا ہے، تو یہ تو درخت کا پھل ہوگیا۔ اِسی طرح انسان ہے، انسان کی رُوح اِس درخت کا پھل ہے اور

عقل اُس پھل کا روغن ہے مغز[ہے]،تو اگر اِس کائنات کو نچوڑا جائے،اِس (Universe) کو نچوڑا جائے تو پھر وہ نچوڑ ست کہلائے گا، جوہر کہلائے گا، رُوح کہلائے گا اور عقل کہلائے گی ،تو اِسی طرح ہر چیز کا پھل اُس چیز کی رُوح کی صورت میں ہوگا،اور عجیب بات ہے کہ کوئی شئ رُوح سے خالی نہیں یعنی ہر چیز کی رُوح اُس چیز کا پھل ہے اور ہر چیز کا جوہر اُس چیز کا پھل ہے،تو بہشت میں عقلی ، رُوحانی اور جلالی غذائیں ہوں گی۔عقلی غذائیں جو عقل کے لئے چاہئیں، رُوحانی غذائیں جن سے رُوح کو تقویت ملے،خوشی ملے، راحت ملے،اور جلالی غذائیں جن سے جسم لطیف کو راحت ملے۔مومن کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہمارا یہ جسم،کثیف جسم ہے، اور اِس کو ہر حالت میں چھوڑنا ہے، مگر یہ نہ سوچا جائے کہ ہم بہشت میں جسم سے محروم ہوں گے، اگر وہاں ہمارا لطیف جسم نہ ہو،تو وہ جنّت ایک خواب کی حیثیت سے بڑھ کر نہیں ہوگی، اِس کے لئے وہاں جسم ہونا چاہئے لیکن کون سا جسم؟ لطیف جسم، معجزانہ جسم اور جس کو (astral body) کہا جاتا ہے اور اِس دنیا میں اور اِس زمانے میں ایسی کچھ مثالیں بھی ہیں، جن کو سامنے رکھ کر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارا ایک لطیف جسم بھی ہوسکتا ہے،تو لطیف جسم ہے اِس کے لئے جلالی غذائیں ہیں خوشبوؤں کی صورت میں اور ہماری رُوح ہے اُس کے لئے رُوحانی غذائیں ہیں اور ہماری عقل ہے اُس کے لئے عقلی غذائیں ہیں اور یہ تین قسم کے غذائیں پھلوں کی صورت میں بہشت میں میسر ہوں گی۔

''عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقَابِلِیْنَ ''(۳۷:۴۴)۔مومنین تختوں پر ہوں گے آمنے سامنے۔اِس ''مُّتَقَابِلِیْنَ ''میں ایک ایسے معنیٰ بھی ہے کہ وہ مومنین دنیا کو بھی دیکھیں گے اور آخرت کو بھی دیکھیں گے۔کیونکہ بہشت کی (definition) کچھ اِس طرح سے ہے کہ ''لَھُمْ فِیْھَا مَا یَشَآءُوْنَ ''(۱۶:۳۱) بہشت ایک ایسی جگہ کا نام ہے کہ وہاں پر مومن کی ہر ہر خواہش پوری کی جاتی ہے جو وہ طلب کرتا ہے اُس کو مل جاتا ہے،تو آپ دیکھتے ہیں، اِس دنیا میں جو مقصدِ اعلیٰ ہے وہ معرفت ہے لیکن اِس مقصدِ اعلیٰ کے تحت اور بھی بہت سارے مقاصد ہیں ہمارے، وہ یہ کہ ہمارے اندر بہت ساری تمنائیں ،خواہشات پیدا ہوجاتی ہیں اور اگر اِن خواہشات کے لئے خدا کے حضور میں کچھ چارہ نہ ہوتا تو انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ خواہشات پیدا ہی نہیں ہوتے یعنی بہت سی خواہشات ہیں جو جائز ہیں، ایسی جائز خواہشات کی تکمیل بہشت میں ہوگی، اِسی معنیٰ میں فرمایا کیا کہ:''لَھُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ فِیْھَا وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ ''(۵۰:۳۵)۔

''یُطَافُ عَلَیْھِمْ بِکَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ (۳۷:۴۵) اُن کے درمیان جامِ شراب گردش کرتا ہوگا۔یعنی بہنے والی شراب کا پیالہ اُن کے درمیان گردش کرتا ہوگا۔''یُطَافُ ''گولائی میں یعنی گردش کرنے کو کہا جاتا ہے،اور''یُطَافُ ''یا''یَطَّوَّفُوْ ''کسی چیز کے گرد طواف کرنے یا چکر لگانے کو بھی کہتے ہیں،''مَّعِیْن ''بہنے والی چیز کو کہا جاتا ہے۔''بَیْضَآءَ لَذَّۃٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ ''(۳۷:۴۶) شراب کا اور پیالے کا دونوں کا رنگ سفید ہوگا اور پینے والوں کے لئے اِس سے بے حد لذّت ملے گی،تو اِس کی تاویل، یہ رُوحانیت کا ایک اعلیٰ مقام ہے، وہاں پر عقل کا ایک مرکز ہے، اُس میں ایک (demonstration) ہے اور اُس

(demosntration) کرنے والی چیز کا رنگ سفید ہے، اور امامؑ نے فرمایا ہے کہ جو سفید رنگ ہے وہ نور الانوار ہے۔ نور کئی رنگوں میں ہوا کرتا ہے، جو انوار کا نور ہے جو انوار کا سرچشمہ ہے، اُس کا رنگ سفید ہے اور گوہرِ عقل کا رنگ سفید ہے اِس شراب سے یہی مراد ہے، اور اُسکی حرکت میں اور اُس کے (demonstration) میں پوری کائنات کے معنیٰ سموئے ہوئے ہیں، خدا کی خدائی کے سارے معانی اُس میں آجاتے ہیں وہ اِس قدر عظیم چیز ہے، تو اُس کی تشبیہہ یہاں بہنے والی شراب سے اور بہنے والی شراب کے جام سے دی گئی ہے، کیونکہ قرآن کا یہ قانون رہا ہے کہ اُس میں ایک ہی حقیقت ہے مگر اُس کی لاتعداد مثالیں ہیں بے شمار تشبیہات ہیں۔

پھر آگے چل کر ایک عظیم الشّان آیت ہے وہ بھی میں آپ کو پڑھ کر اُس کی حکمت کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ''وَعِنْدَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ۝ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ''(۳۷:۴۸۔۴۹) اور اُن مومنین کے پاس حوریں ہوں گی، جن کی بڑی بڑی آنکھیں ہیں اور وہ ایسی حیادار کہ نظریں جھکائی رہتی ہیں۔ آپ کو تعجب ہوگا جب میں اِس کی تاویل بیان کروں گا۔ عِيْنٌ = (ع+ی+ن) عِيْنٌ، قرآن کی زبان میں ایسی عورتوں کا نام ہے جن کی آنکھیں بڑی بڑی ہوتی ہیں اور ''قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ'' اُن کو کہتے ہیں جن کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ مثال ہے ایک ایسے علم کی کہ وہ علم پوری کائنات پر محیط ہے، اُس کی رسائی عرصۂ امکان تک ہے اور ''مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ'' ہر چیز پر وہ علم محیط ہے لیکن اُس علم نے تمام چیزوں کو یکجا کرلیا ہے۔ دیکھا آپ نے کہ اِس میں دو باتیں ہیں، ایک یہ کہ عِيْنٌ کے معنیٰ ہیں بڑی بڑی آنکھیں، بہت دُور تک دیکھنے والی حقیقت یا بہت دُور تک پہنچنے والا علم، اور ''قَاصِرَات'' کا مطلب ہے کہ یعنی اُس علم کو جمع کرنے کی صلاحیت، ایک ایسی مثال، ایک ایسا مقام، ایک ایسا رُتبہ۔ پھر اِس کی تائید میں فرمایا جاتا ہے کہ: ''كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ''(۳۷:۴۹) وہ گویا چھپائے ہوئے انڈے ہیں۔ پھر وہی بات گوہر، گوہرِ عقل، تو گوہرِ عقل کی تشبیہہ و تمثیل طرح طرح سے دی گئی ہے جو چیز انڈے کی طرح سفید ہے، جو پوشیدہ ہے وہ گوہرِ عقل ہے اور اُسی کی یہ مثال ہے۔ کبھی اِس کی مثال شراب سے دی جاتی ہے، کبھی حورِعین سے اِس کی تشبیہہ و تمثیل دی جاتی ہے، تو خداوندِ عالم نے اعلیٰ ترین حقیقتوں کو لوگوں سے، نااہلوں سے اِس طرح پوشیدہ رکھیں ہیں، کہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے کہ اِس کو پائے۔ آپ کسی بھی ظاہری کتاب کو اُٹھا کے جس میں اِس سلسلے کا کوئی موضوع ہو، اندازہ کرسکتے ہیں کہ واقعاً امام کا خزانہ کیسا ہے اور اُس کو خدا نے کس طرح محفوظ رکھا ہے، غیروں کی رَسائی سے اِس کو محفوظ رکھا ہے۔

آگے چل کر ایک آیت ہے جو حضرت نوح علیہ السلام سے متعلق ہے: ''وَنَجَّيْنَاهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبَاقِيْنَ ''(۳۷:۷۶۔۷۷) ہم نے نوح کو اور اُس کے لوگوں کو بڑی سختی سے نجات دی یعنی طوفان سے، اور اُس کی ذرّیت کو اِس دنیا میں باقی رکھا۔ ظاہری طور پر اِس کے معنیٰ یوں ہیں کہ جب طوفان اُٹھا تو وہ سب

لوگ جونوح علیہ السلام کے نافرمان ہو چکے تھے،طوفان میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے،مگر کشتی میں جولوگ سوار تھے اُنہی کی نسل سے دنیا از سرِ نو آباد ہوگئی،ظاہری قصہ کچھ اِس طرح سے ہے۔لیکن اِس کی تاویل یوں ہے کہ اِس ظاہری طوفان کے مشابہہ ایک رُوحانی اور باطنی طوفان برپا ہوا وہ رُوحوں کا طوفان تھا،اور اُس میں سارے جہان کے لوگ ہلاک ہو گئے،مگر جو رُوحیں نوح علیہ السلام کی ذرّیت بن کر تھیں یعنی رُوحانی اولاد بن کر تھیں،اُنہی سے رُوحوں کی دنیا از سرِ نو پھیل گئی۔لیکن یہ وضاحت کافی نہیں ہے اِس میں مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن کسی کی قرابت داری کسی کا حسب ونسب باقی نہیں رہے گا،صرف ایک ہی خاندان کا حسب ونسب باقی رہے گا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذرّیت اور اُن کا حسب ونسب باقی رہے گا باقی سارا حسب ونسب منقطع ہو جائے گا[فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّي يَقْبِضُنِي مَا يَقْبِضُهَا وَيَبْسُطُنِي مَا يَبْسُطُهَا وَإِنَّ الْأَنْسَابَ تَنْقَطِعُ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غَيْرَ نَسَبِي وَسَبَبِي وَصِهْرِي،ترجمہ: فاطمہ میرے گوشت کا ٹکڑا ہے جو چیز اسے رنج پہنچاتی ہے وہ مجھے رنج پہنچاتی ہے اور جو چیز اسے خوشی پہنچاتی ہے وہ مجھے خوشی پہنچاتی ہے اور بے شک قیامت کے دن سوائے میرے نسب،سبب اور دامادی کے دیگر نسب ختم ہو جائیں گے"کتاب:گنجینۂ جواہرِاحادیث،صفحہ نمبر ۶۰] تو چنانچہ ہر پیغمبر اور ہر امام کے زمانے میں ایک رُوحانی ہلاکت خیز طوفان برپا ہو جاتا ہے رُوحوں کا،اُس میں تمام نافرمان لوگوں کی رُوحیں ہلاک ہو جاتی ہیں اور صرف ہادیٔ زمانؑ سے جو وابستہ لوگ ہیں اُن کی رُوحیں باقی رہتی ہیں۔اِسی مناسبت سے میں نے اِس آیت پر نشان لگایا ہے تاکہ میں آپ کے سامنے اِس کو بیان کروں۔

"سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ" (۳۷:۷۹۔۸۱)اِن تین آیات میں بڑی بڑی حکمتیں ہیں۔دنیا والوں میں نوح علیہ السلام پر سلامتی ہے،اِس کا کیا مطلب؟یعنی نوح علیہ السلام کی اپنی نسل سے اِس دنیا میں جو رُوحیں باقی ہیں،اُن رُوحوں میں نوح علیہ السلام زندہ ہے،اُن کی سلامتی ہے،اُن کو کچھ نہیں ہوا وہ سلامت ہے۔جہاں پر نفسِ کُلی کی بات ہے یا جہاں پر نفس واحدہ کی بات ہے،اور جس طرح حدیث میں ارشاد ہوا ہے:"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ وَ الْاَنْبِيَاءُ كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ" ۔مومنین کی یگانگت(unity) کا بس یہی حال ہے کہ وہ بھائی بھائی ہیں اور پیغمبروں کی(unity) کی یہ بات ہے کہ وہ ایک جان کی طرح ہیں،تو مطلب یہ ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آج دنیا میں کسی بڑی رُوح کے اندر ہیں،وہ نفس واحدہ ہے،وہاں پر نوح علیہ السلام بھی ہے،اِسی معنیٰ میں وہ سلامت ہے،ہر پیغمبر سلامت ہے،ہر امام سلامت ہے اور بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی ہے،"اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ" (۳۷:۸۰)یہ جس طرح سے نوح علیہ السلام کو اجر وصلہ دیا گیا،ایسا اجر وصلہ ہر محسن کو ہر نیکوکار کو دیا جاتا ہے،تو خداوندِ عالم نے اپنی اِس عظیم رحمت کو عام کر دیا،ایک عام رحمت کا اُصول بنا دیا۔پہلے تو نوح علیہ السلام کی مثال میں ہم کو سمجھایا کہ

نوح علیہ السلام کے لئے کیا مہربانی ہوگئی پھر اُس کے ساتھ سب مومنین کو سب محسنین کو منسلک کر کے بتایا اور یہی نہیں اور تیسری آیت بھی سن لیجئے: ''اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ''(۳۷:۸۱) وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ اِس میں یا تو مومنین کو نوح علیہ السلام کی سطح پر بلند کر دیا یا یہ کہ اِن کی خاطر سے نوح علیہ السلام کو نیچے لا کر مومنین کے درمیان میں رکھا۔ محسنین کی مثال میں بھی اور مومنین کی مثال میں بھی تا کہ ہم سمجھیں کہ جو صراطِ مستقیم پر چلتا ہے وہ پیغمبروں کے نقشِ قدم پر چلتا ہے اور جہاں پیغمبر جاتے ہیں یہ بھی اُن کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ پہنچ جاتا ہے، اور اِن دو آیتوں سے واضح ہے، چونکہ یہ بہت شاندار آیتیں ہیں اِس لئے میں اِن کو دہراتا ہوں۔''اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ''ہم نیکو کاروں کو ایسا ہی اجر وصلہ دیا کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے! اِس سے کوئی انکار نہیں کہ محسنین سب سے پہلے انبیاء و اولیاء ہیں ٹھیک ہے! لیکن یہ رحمت انبیاء و اولیاء تک محدود نہیں ہے، اِس رحمت کے سمندر کی لپیٹ میں مومنین بھی آجاتے ہیں اور''اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ''وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا، وہی بات کہ مومنین کو نوح علیہ السلام کی سطح پر اُٹھایا یا یہ کہ مومنین کی خاطر سے نوح علیہ السلام کو نیچے لایا مومنین کے درمیان رکھا تا کہ مومنین کی حوصلہ افزائی ہو۔

اِس کے بعد بہت ساری آیات سے آگے بڑھ کر ایک مقام پر آتا ہوں، جہاں فرمایا گیا ہے:''وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ''(۳۷:۱۱۴) تحقیق ہم نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا۔ اِس میں بھی عظیم حکمت ہے کہ ربّ العالمین موسیٰ اور ہارون کے مقصد کو ایک کر کے بتاتا ہے۔ اِس آیت میں بھی اور دوسری کئی آیات میں بھی اُن کو ایک جان کی طرح، اور ایک ہی مرتبے میں لیتا ہے، اور فرماتا ہے کہ ہم نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا تا کہ کوئی مسلمان اِس بات کو سمجھے کہ خدا نے اپنی عادت کے مطابق جس طرح زمانۂ موسیٰ میں ایک پیغمبر کو اور ایک امام کو رکھا تھا، اِسی طرح ہر زمانے میں یہی ہوتا رہا ہے اور آنحضرتؐ کے زمانے میں بھی پیغمبر اور امام، اور پیغمبر اور امام دونوں کا مقصد ایک ہے۔ ''وَنَصَرْنَاهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغَالِبِيْنَ ''(۳۷:۱۱۶) اور ہم نے اُن کو مدد دی اور اِس مدد کے نتیجے میں وہ غالب آئے، زمانے میں جو مخالفین یا دشمنانِ دین تھے، اُن پر یہ غالب آئے۔''وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ''(۳۷:۱۱۷) اور ہم نے اُن کو بولنے والی کتاب دی۔''مُسْتَبِيْنَ ''یعنی خود بولنے والی کتاب کا نام ہے، یہ دونوں کا نور تھا، دونوں کی رُوحانیت تھی جو بولنے والی کتاب کی حیثیت سے تھی اور اِس معنیٰ میں قرآن کی اُن تمام آیات میں جہاں کہیں کتاب کا نام آتا ہے، تو اُس سے یہی بولنے والی کتاب یعنی امام کا نور مراد ہوتا ہے۔

''سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ''(۳۷:۱۲۰) موسیٰ اور ہارون پر سلامتی ہے۔ دیکھیے کہ انسان کسی کو سلام کرتا ہے یہ کچھ اور ہے، خدا کسی کے بارے میں کہتا ہے سلام، یہ کچھ اور ہے۔ جب انسان کہتا ہے، تو یہ دعا کی صورت ہوتی ہے، جب خدا کہتا ہے کہ سلامتی ہے تجھ پر، تو یہ سلامتی کے آخری معنی بنتے ہیں۔ خدا کا قول دُعا نہیں ہوسکتا ہے، دُعا کسی سے

مانگنے کے معنی میں ہے، کسی سے مانگنے کا نام ہے، خدا کس سے مانگے؟ تو خدا کی بات حتمی ہوتی ہے، آخری ہوتی ہے اور اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام پر سلامتی ہے، وہ سلامت ہیں۔ ''اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ'' (۳۷:۱۲۱۔ ۱۲۲) دیکھیں کہ وہی بات کہ بے شک ہم نیکو کار لوگوں کے لئے یا نیکو کاروں کے لئے ایسا ہی اجر وصلہ دیا کرتے ہیں اور یہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے تھے، تو مومنین کو از راہِ کرم موسیٰ اور ہارون کی سطح پر بلند کرتا ہے یا یوں کہا جائے کہ مومنین کی خاطر موسیٰ اور ہارون کو اِن کی سطح پر لے آتا ہے یعنی یہ ممکن قرار دیتا ہے کہ جو رحمت موسیٰ اور ہارون کی بابت بیان ہوئی، وہی رحمت مومنین کے لئے بھی ممکن ہے۔ ایک آیت ہے: ''سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ'' (۳۷:۱۳۰) قرآن کے بعض مقامات ایسے ہیں کہ اُن کی قرأت کئی طرح سے ہے۔ اِس ''اِلْ يَاسِيْنَ'' کی ایک دوسری قرأت ''اٰلِ يَاسِيْنَ'' ہے یعنی سلامتی ہے آنحضرتؐ کی آل پر، اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آلِ محمدؐ سے ائمہ طاہرین مراد ہیں تو آلِ محمدؐ پر سلامتی ہے، وہ کامیاب ہیں، وہ سلامت ہیں، وہ ملاءِ لاعلیٰ ہیں اور وہ خدا کے نور ہیں۔

اِس سورہ کو پوری طرح سے پڑھنے کے لئے بہت وقت درکار ہے، تاہم میں نے اِس میں سے صرف چند آیات کو لیا ہے، یہ سورۂ صافات ہے، لہٰذا میں آخری ایک آیت کو لیتا ہوں: ''سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ'' (۳۷:۱۸۰) پاک ہے تیرا پروردگار جو عزّت کا پروردگار ہے، اُن اوصاف سے جو وہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ یہ جاہل لوگ خدا کو خدا مانتے ہوئے، خدا کا تصور رکھتے ہوئے جو کچھ اُس کے اوصاف بیان کرتے ہیں، اُن اوصاف سے خدا پاک ہے اور وہ عزّت کا پروردگار ہے۔ دیکھیں! عزّت تو عام لوگوں کے نزدیک ایک لفظ ہے لیکن خدا جس طرح سے فرماتا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی سب سے بڑی پرورش اعلیٰ سطح کی پرورش عزّت کے لئے ہے۔ لوگ خدا کو عزّت بیان کرتے ہیں لیکن خدا کہتا ہے کہ میں عزّت نہیں ہوں، میں عزّت کا پروردگار ہوں، میں درجات نہیں ہوں، میں درجات کا پروردگار ہوں، میں عرش نہیں ہوں، میں عرش کا پروردگار ہوں یعنی اُس کا پالنہار ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ عزّت کو وہ بلند کرتا ہے اور آخری مقام تک پہنچا دیتا ہے، تو خدا کے بہت سے اوصاف ہیں جو حدود کے لئے ہیں خدا کے لئے نہیں ''سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ'' (۳۷:۱۸۰)۔ دیکھیں کہ لوگ کہتے ہیں خدا ہر نقص سے، ہر عیب سے پاک ہے، یہ کتنی کمزور بات ہے، خدا کے تصور کے بیان کے ساتھ ساتھ نقص اور عیب! قرآن میں ایسا نہیں ہے، خدا تو اوصاف سے پاک ہے، اُس کی مخلوق کے جو اوصاف ہیں وہ اُس سے بری ہے، وہ برتر ہے، وہ سبحان ہے۔ عیب اور نقص سے کسی کامل انسان کو پاک قرار دینا چاہئے اور خدا کی صفت اِس طرح سے نہیں ہوتی ہے۔ قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس کے مطابق ہونا چاہئے وہ یہ کہ: ''سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ'' (۳۷:۱۸۰) وہ جو کچھ وصف کرتے ہیں، اُس سے وہ پاک ہے کیونکہ وہ عزّت کا پروردگار ہے۔ ''وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ'' (۳۷:۱۸۱) تمام پیغمبروں پر

سلامتی ہے۔سلامتی پر ایک چھوٹا سا مقالہ لکھنا ابھی باقی ہے،اُس میں آپ کو بتائیں گے کہ سلامتی کے کیا معنی ہوتے ہیں اور خدا کو سلام کا نام کیوں دیا گیا ہے اور دارالسّلام کے کیا معنی ہیں؟ سلامتی کا گھر،خدا کا گھر کیونکہ سلام خدا کا نام ہے،تو دارالسّلام کا مطلب خدا کا گھر۔خدا کے گھر میں ہم کو داخل کرے،معلوم نہیں کیا ہمارا حشر ہوگا جب خدا کے گھر میں داخل ہو جائیں گے،تو پھر یہ نہیں معلوم اُس میں بھی غلامی رہے گی اور ہم سے خدا کیا کام لینا چاہے گا،تو خدا کے گھر میں کسی قسم کا کوئی چھوٹا کام ہے نہیں،خدا کوئی بادشاہ نہیں ہے کہ ہم گھریلو خدمت کریں،یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہم خدا کے گھر میں کس معنیٰ میں داخل ہو جائیں گے۔ایسا تو نہیں ہے کہ ہم اصل سے واصل ہو جائیں گے،ایسا تو نہیں ہے کہ یہ بھی ایک مونور یالزم کا تصور ہے،ایک بھید ہے،تو وہ بعد میں کوشش کریں گے،آپ دعا کریں۔

اِس میں آخری ایک بات رہ گئی ہے:''وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ''(۳۷:۱۸۲)اور تعریف ہے عالَموں کے پروردگار کے لئے اور عقل،عالَموں کے پروردگار کے لئے ہے۔اِس میں کئی معنی ہیں،ایک معنی تو یہ ہے کہ تعریف ہے عالموں کے پروردگار کی،جس طرح الحمد میں ہے کہ:''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ''(۱:۱)خدا اپنی ستائش اور تعریف کسی اور چیز پر نہیں کرنا چاہتا ہے مگر جو نظامِ رُبوبیت ہے،اُس پر وہ اپنی ذات کی تعریف کرتا ہے یعنی اُس کا جو نظامِ رُبوبیت ہے جو پالنے کا نظام ہے،وہ بڑا عجیب ہے،وہ بہت ہی منظّم ہے،اِس میں یہ اشارہ ہے کہ دنیا میں جو عقلی پرورش ہے،وہ خدا کی طرف سے ہر وقت مہیا ہے،امامؑ کی صورت میں اور پیر ناصر خسروؒ نے اِس پر بہت ہی روشن (chapter) لکھ دیا ہے اپنی جو مشہور کتاب ہے''وجہ دین''میں اور اُنہوں نے یہاں تک بھی کہا ہے کہ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ خدا کی طرف سے لوگوں کے درمیان کوئی پروردگار ہو،پروردگار یہ صرف خدا کے لئے استعمال نہیں ہے،پالنے والا، ماں باپ کے لئے بھی یہ استعمال ہوتا ہے،تو عقلی طور پر پالنے والا علمی اور عقلی صورت میں،تو خدا اِس معاملے میں اپنی تعریف آپ کرتا ہے کہ وہ عالموں کا پروردگار ہے۔اُس نے کبھی انسان جیسی شریف مخلوق کو نظر انداز نہیں کیا ہے،کہ اُس کی عقلی پرورش کے لئے انتظام نہ کرے،تو جبکہ جانور کو اُس نے پیدا کیا تو اُس کی پرورش کے لئے بہت سارے سامان مہیا کر دیئے ہیں،اور انسان کو جسمانی طور پر پالنے کے لئے اُس نے کیا کچھ نہیں کیا ہے،مگر جہاں علم اور عقل کا سوال آتا ہے تو اِس میں کچھ اور منظّم طریقے سے اُس نے اپنے نظامِ رُبوبیت کو قائم کیا ہے یعنی عقلی غذائیں اُس نے دنیا میں مہیا رکھی ہیں،صرف بات ہے کہ کوئی اِس پروردگار کو پہچانے،تو اِس پر یہ سورہ ختم ہوتا ہے جو(۱۸۲) آیات پر مشتمل ہے اور اِس سلسلے میں آپ سے یہ بھی عرض کروں کہ بہت سی سورتیں ایسی ہیں،اُن کے آخر میں کچھ نہ کچھ (important) آیتیں ہوا کرتی ہیں۔جس طرح کوئی دانش مند اپنا کوئی مقالہ پیش کرتا ہے یا اپنی کوئی تقریر کرتا ہے،تو اُس کے آخر میں خلاصے کے طور پر یا (conculsion) کے طور پر وہ تمام ایسے جملے کو یا ایسے الفاظ کو لانے کے لئے یا پیش کرنے کے لئے کوشش کرتا ہے

اور بعض دفعہ کامیاب ہو جاتا ہے کہ اُن الفاظ میں اُس کی ساری تقریر کی رُوح جمع ہو، یہ تو انسان کی مثال ہوئی اور خدا جو احکم الحاکمین ہے، بڑا دانا ہے، بڑا حکیم ہے، بہت حکمت والا ہے چنانچہ اُس نے قرآنِ حکیم کی بیشتر سورتوں کے آخر میں بہت ہی پُرحکمت آیات رکھی ہیں، اِس کو خواتم کہتے ہیں یعنی خاتمہ کی جمع خواتم، تو علمائے ظاہر نے بھی اِس کو تسلیم کرلیا ہے اور علّامہ جلال الدّین سیوطی ایک بہت عالم گزرا ہے، اُس نے ''الاتقان'' میں قرآن پر بہت کام کیا ہے ظاہری طور پر جو کچھ اُس سے ہوسکا ہے، تو وہ بھی اِن چیزوں کو مانتا ہے اور بہت ساری سورتوں کے خواص کو بھی ظاہری اعتبار سے بیان کرتا ہے اور جس طرح سے اُس کو ظاہری روایت ملی ہے اُس کے مطابق۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ اسماعیلیوں کی حیثیت سے ہمیں قرآن کے بھیدوں کو کس طرح سے جاننا چاہئے اور اگر ہم اِن بھیدوں کے جاننے میں یا اِس کے انکشاف میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم اِس نعمتِ عظمیٰ پر شکر گزار ہوں گے کہ ہم کو اسماعیلی مذہب ملا ہے اور ہم کو ست پنتھ کی ہدایت ملی ہے، امامِ عالی مقامؑ کا مقدّس دامن ہاتھ آیا ہے، تو اِس کے لئے ہم زیادہ سے زیادہ شکر گزار ہوں گے، جبکہ ہم قرآن کے بھیدوں کو سمجھ سکیں گے اور اِس میں بہت بھلائی ہوگئی، ہم اپنے ہم جنسوں کی مدد کرسکیں گے، اُن کی خدمت کرسکیں گے اور مولا کی خدمت کرسکیں گے، اِس کے لئے میری گزارش ہے، کہ آپ جان و دل سے اِس کے لئے جدوجہد کریں قرآن کے بھیدوں کو جاننے کے لئے اور اِن کو لکھنے کے لئے کتابوں کے ذریعے سے، مقالوں کے ذریعے سے اور کیسٹوں کے ذریعے سے۔ اِسی کے ساتھ میں اپنی اِس ناچیزی کوشش کو اِس گفتگو کو یہاں پر ختم کرتا ہوں اور اگر کسی عزیز کا کوئی سوال ہے، تو میں کوشش کروں گا کہ اُس سوال کے لئے ایک گونہ جواب مہیا کرسکوں۔ یا علی مدد، شکریہ۔

سوال: (شہناز سلیم ہونزائی: سر مونور یالزم کے سلسلے میں آپ نے جیسے فرمایا کہ واحد اور احد میں فرق ہے اور احد اُس آخری درجے کے لئے آتا ہے لیکن پھر اِس کے ساتھ قرآن میں جہاں وحدانیت آتا ہے وہ پھر مونور یالزم کا تصور دیتا ہے؟ سر)۔

جواب: اِن کے سوال کو آپ نے سن لیا احد اور واحد کے معنی میں فرق نہیں ہے مگر سمجھنے کے اعتبار سے فرق ہے، احد میں ہم اتنا کچھ نہیں سمجھیں گے جس طرح ہم واحد میں سمجھیں گے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ واحد جو ہے فاعل کے معنی میں ہے، جب فاعل کے معنی میں ہے، تو ہمیں سمجھنے کے لئے آسانی ہوتی ہے اور ویسے تو احد اور واحد دونوں عام طور پر بھی استعمال ہے قرآن میں اور خاص طور پر بھی استعمال ہے یعنی خدا کے لئے بھی استعمال ہے اور اشیا یا مخلوق اور دوسری چیزوں کے لئے احد اور واحد استعمال ہے، تو یہ عام سے عام بھی ہیں اور خاص سے خاص بھی ہے۔ لیکن اِن دونوں میں معنی کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے، سمجھنے کے اعتبار سے یہ فرق ہے کہ ہم احد کو نہیں سمجھیں گے اور پہلے واحد کو سمجھیں گے، جب

واحد کو سمجھیں گے تو احد کا مطلب بھی یہی ہوگا۔ وحدانیت جو ہے وہ تو، اگر ہم اِس کو فاعل مانتے ہے تو وہ اِس کے فعل کی صورت ہوگی، لہٰذا اُس میں فعل کی صورت ہوگی، مگر یہ وحدانیت جو ہے قرآن میں اِس طرح سے استعمال نہیں ہوا ہے، گو کہ دوسرے مقامات پر، کتابوں میں، تصوف میں اور احادیث میں یہ آیا ہے مگر قرآن میں وحدانیت اِسی شکل میں نہیں ہے، تو مونو ریالزم کا جو تصور ہے وہ اِسی واحد میں اور احد میں صحیح ہے، اور کیونکہ اِس کی تشریح دوسری آیت سے ہوتی ہے، مثلاً ایک آیت ایسی ہے کہ اُس میں انسان کے خدا کی طرف لوٹ جانے کا ذکر ہے، اُس میں فرمایا جاتا ہے کہ تم میرے پاس تنہا آؤ گے (۱۹:۸۰) اور وہ تمام چیزیں اپنی پشت کے پیچھے چھوڑ کر آؤ گے جو ہم نے تم کو اضافی طور پر دی تھیں۔ اِس میں سوچا گیا ہے اور دیکھا گیا ہے، کہ انسان خدا کے پاس جب جاتا ہے، تو کوئی چیز ذاتِ خدا میں ضم نہیں ہوتی ہے، صرف یہ ایسا ہے کہ اپنے آپ کو بھول جانے اور نظر انداز کرنے کی صورت میں خدا میں فنا ہو جایا جاتا ہے، اور اِس سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں بھی خدا کی ذات سے کوئی شئ خارج نہیں ہوئی تھی جو ابتدا میں خدا کی ذات سے کوئی چیز خارج نہیں ہوئی تھی تو پھر کس طرح کوئی شئ ذاتِ خدا میں داخل ہو سکتی ہے۔ وہ مقام جیسا بھی ہے، وہ نور، وہ دیدار، وہ مشاہدہ، وہ تصور، ایسا نہیں کہ کوئی یہاں سے جائے اور اُس میں داخل ہو جائے۔ جیسے امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ خدا کا مقام ایسا نہیں ہے کہ وہاں پر کوئی چیز وہاں پر جائے، وہاں پر تو صرف خیال جا سکتا ہے، تو معراج کی مثال میں، معراج کے قصّے میں یہ کہنا صحیح ہے کہ جبرائیل اور دوسرے فرشتے حضورؐ کے ہم رکاب تھے، وہ تو پیچھے رہ گیا اور حضورؐ تنہا تنہا مقامِ اعلیٰ پر گئے، وہاں پر صرف ایک مشاہدہ ہوا اور ایک دیدار۔

دیکھیں کہ قیامت میں جو کچھ واقعہ پیش آنا چاہئے، وہ پیشگی طور پر اِس قصۂ معراج میں موجود ہے کیونکہ خدا خود ہی اِس میں زور دیتا ہے کہ آنحضرتؐ کے اور خدا کے درمیان جو قرب تھا وہ انتہائی تھا کہ اُس سے بڑھ کر قیامت میں اور قرب نہیں ہو سکتا۔ ''فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى'' (۹:۵۳) ممکن نہیں ہے کہ قیامت میں اُس سے کوئی بڑھ کر قرب حاصل ہو، اور یہ قربِ مثالی تھا دوسرے سب انسانوں کے لئے، اگر خدا سے جا ملنے کی اور کوئی قسم ہوتی اور کوئی نوعیت ہوتی تو آنحضرتؐ سے کوئی جزو خدا سے جا ملتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ معراجِ رُوحانیت سے لوٹ کر آئے، درآن حال آپ خدا میں فنا ہو گئے، فنا اِس معنیٰ میں کہ صرف ایک مشاہدہ کیا ایک دیدار اور کچھ نہیں، ایک شناخت، ایک معرفت، اُن پر یہ راز منکشف ہو گیا کہ اُسی ہستی میں پیغمبر کی انا ہے بلکہ وہ ہستی تمام ہستیوں کا سرچشمہ ہے، وہی حقیقت ہے، وہی نورِ ازل و ابد ہے، تو اِس کی ایک شناخت تھی ایک معرفت۔ ہم کو یہ مثال بھی ملتی ہے کہ اُس ہستی میں سے چاہے علیؑ کی آواز آئی یا چاہے ابوبکر کی آواز آئی، یہ بھی ایک قابلِ غور بات ہے، یہ بھی مونو ریالزم کا ایک نمونہ ہے، تو اگر یہ مانا جائے کہ رُوئے زمین پر بسنے والوں میں سے ایک کامل انسان کی انا یا آواز اُس ہستی میں تھی پھر تو سمجھنے والوں کے لئے بات ہی ختم ہو گئی کہ وہ مونو ریالزم کا

تصور تھا اور خدا جو عزّت کا پروردگار ہے، اُس مقام تک عزّت کو اُٹھاتا ہے، اُٹھاتا ہے عقلی طور پر، علمی طور پر، عرفانی طور پر، مادّی طور پر نہیں، جسمانی طور پر نہیں، تو ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ معراج سے آنحضرتؐ پھر دنیا میں کیوں آئے اور ایسے آئے جیسے گئے تھے، کہ آپ کی ذات میں سے نہ کوئی رُوح اور نہ کوئی اور شئ وہاں داخل ہوئی کوئی چیز نہیں! مگر دیدار ہوا اور شناخت حاصل ہوئی کیونکہ اُس نور میں کوئی خلا نہیں ہے کوئی جگہ نہیں ہے، تو میرے خیال میں آپ کے اِس واحد اور احد کے سلسلے میں جو سوال اُٹھایا تھا، اُس کے لئے ایک طرح سے جواب مہیا ہوا ہوگا۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپ: سلیمہ ہونزائی　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی ؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: قرآنِ حکیم میں تصورِ وراثت

کیسٹ نمبر: No.Q-48 تاریخ: ۱۶/ ۲/ ۱۹۸۴ء کراچی

Click here for Audio

یاعلی مدد!

صاحبان! آج میری یہ آرزو ہے، کہ قرآنِ مقدّس میں جو میراث کا موضوع ہے اُس میں سے کچھ غور وفکر کریں گے اور کچھ پانے کے لئے، کچھ بولنے کے لئے اور کچھ سیکھنے کے لئے کوشش کریں گے۔ اِس خاص موضوع کے آغاز سے پہلے ہمیں دنیوی مثال میں لفظِ میراث کا کچھ تجزیہ کرنا چاہئے، کہ میراث اِس کا نام ہے کہ کوئی گھر کا مالک، کوئی بزرگ، کوئی جائیداد والا گزرتا ہے، تو پھر اُس کی جائیداد اُس کے وارثین میں تقسیم ہوجاتی ہے، میراث اِس چیز کا نام ہے اور جو میراث پانے والا ہوتا ہے اُس کو وارث کہا جاتا ہے، اور اِسی مثال کے مطابق قرآن میں میراث سے متعلق کئی آیاتِ کریمہ ہیں جو سب مل کر ایک موضوع کو بناتے ہیں، اور ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اِس میراث کی تاویل کیا ہے۔ میراث کے ظاہری مطلب کو سمجھنے کے بعد ہم زیادہ سے زیادہ یہ کوشش کرنا چاہتے ہیں کہ اِس کے رُوحانی اور تاویلی پس منظر کو سمجھیں اور اُس پر روشنی ڈالنے کے لئے کوشش کریں۔ کیونکہ دین میں وارث کا تصور پایا جاتا ہے، جو زمانۂ آدم سے چلا آیا ہے کہ ہر پیغمبر اور ہر امام نے اپنی زندگی ہی میں اپنی اولاد میں سے یا قریبی رشتہ داروں میں سے کسی کو اپنا وارث بنایا ہے اور یہ خدا کی عادت میں سے ہے، اور اِسی خدا کی عادت کے مطابق خداوندِ عالم نے خاندانِ نبوّت اور خاندانِ امامت کو آسمانی کتاب، رُوحانیت، رُوحانی سلطنت اور ہدایت کا وارث قرار دیا۔ اِس سلسلے کی بھی کئی آیات ہیں اور جہاں خاندانِ نبوت و امامت کے وارثِ کتاب ہونے کا ذکر ملتا ہے، تو اُس میں ہمیں اچھی طرح سے سوچنا چاہئے، اور ہماری سوچ کا یہ نتیجہ ہونا چاہئے کہ خداوندِ عالم، کتاب جیسی دائمی شئ کے ساتھ خاندانِ نبوّت کو وابستہ کرکے امامت کے دائمی تصور کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ یہی تو خدا کی حکمت ہے کہ ایک باقی رہنے والی چیز کے ساتھ دوسری کسی چیز کو وابستہ کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ چیز بھی پہلی چیز کی طرح دنیا میں دائم وقائم ہے۔ جیسے خاندانِ ابراہیم کے باب میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا نے اُن کو کتاب، حکمت اور ملکِ عظیم عنایت کردیا ہے (۴:۵۴) اِس میں آپ بخوبی سوچ کر یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ اِس کتاب سے قرآن مراد ہے، اور خاندانِ ابراہیم خاندانِ محمّد ہے، اور کتاب دین کی ظاہری حکومت ہے اور حکمت سے تاویل مراد ہے اور

ملک عظیم امام کی رُوحانی بادشاہی ہے۔

اب اِس تمہید کے بعد ایک ایک کر کے قرآن کی اُن چند آیات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے جو میراث سے متعلق ہیں۔

سب سے پہلے ایک آیت سامنے ہے اور وہ یہ ہے: بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ وَاَوۡرَثۡنَا الۡقَوۡمَ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا یُسۡتَضۡعَفُوۡنَ مَشَارِقَ الۡاَرۡضِ وَمَغَارِبَہَا الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡہَا وَتَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ الۡحُسۡنٰی عَلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ بِمَا صَبَرُوۡا وَدَمَّرۡنَا مَا کَانَ یَصۡنَعُ فِرۡعَوۡنُ وَقَوۡمُہٗ وَمَا کَانُوۡا یَعۡرِشُوۡنَ (۷:۱۳۷) اِس کا مختصر ترجمہ: اور ہم نے اُن لوگوں کو جو کہ بالکل کمزور شمار کئے جاتے تھے اُس سرزمین کے مشارق و مغارب کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی ہے اور آپ کے ربّ کا نیک وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں اِن کے صبر کی وجہ سے پورا ہوگیا، یہاں تک اِس کا ظاہری ترجمہ ہوا۔ اب ہم اِس کی تاویلی حکمت کو پیش کرنے کے لئے کوشش کرتے ہیں، خدا کی یہ عادت ہے کہ جن مومنین کو دنیا کے کفّار کمزور قرار دیتے ہیں، تو خداوندِ عالم اُن کو عالمِ عقل کے مشرقوں اور مغربوں کا مالک بنا دیتا ہے، اور اُس عالمِ عقل میں بہت سی برکتیں ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جس زمین کا یہاں ذکر ہو رہا ہے اُس زمین کے مشارق و مغارب کا نام لیا جاتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ فرمایا جاتا ہے کہ اُس میں بہت سی برکتیں ہیں اور خداوندِ عالم اپنے اِس احسان کو اہمیت دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ اِس طرح ہم نے بنی اسرائیل پر اپنی رحمت اور اپنی مہربانیوں کو تمام کر دیا، اِس لئے کہ اُنہوں نے مصیبتوں میں صبر کیا تھا، تو یہ ساری تعریف اِس لئے ہے کہ اُن کو عالمِ عقل عطا ہو جاتا ہے جس کے مشرقوں اور مغربوں میں بہت سی برکتیں ہیں۔ عقل کی دنیا کے باب میں اہتمام کے ساتھ مشارق و مغارب کا یہ ذکر اِس لئے ہے، کہ اُس کے ہر طلوع اور غروب میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ وہاں پر جو سورج ہے وہ نور کا سورج ہے، وہ عقل کا سورج ہے، وہ علم کا سورج ہے اور اُس سورج کے طلوع ہونے میں اور غروب ہونے میں بہت سی عقلی اور علمی برکتیں ہیں اور خدا کے حضور میں سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ وہ ایک جہان کو جہانِ عقل کو، جہانِ علم کو عطا کر دیتا ہے۔ یہ بنی اسرائیل پر سب سے بڑا احسان تھا کہ اُن کو عالمِ عقل کی زمین کے مشارق و مغارب کا وارث قرار دیا۔

یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ بات صرف بنی اسرائیل کے لئے خاص ہے یا اِس میں اور کوئی اشارہ بھی ہے؟ تو اِس کے لئے گزارش یہ ہے کہ یہ دو طرح سے دوسرے مومنین کے ساتھ متعلق ہے۔ ایک یہ کہ کسی بھی پیغمبر کی اُمت جو فرمانبردار ہو، اُس کی کامیابی میں دوسرے مومنین کی بھی کامیابی کا اشارہ پایا جاتا ہے، اور اِس حکم کے ہمیشہ اُصول کے طور پر رہنے کا دوسرا ثبوت یہ ہے، کہ اسرائیل حضرت یعقوبؑ کا نام ہے، اور بنی اسرائیل، حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں کا نام ہے اور زمانے میں جو ہادیٔ برحق ہے وہ رُوحانی (sense) میں یعقوبؑ ہے اور جو بامراد اور فرمانبردار مومنین ہیں وہ یعقوبؑ کے بیٹے ہیں۔ لہٰذا قرآن میں جہاں جہاں بنی اسرائیل کا ذکر آتا ہے اُس میں زمانے کے مومنین کے لئے

اشارہ، ہدایت، علم، حکمت اِس معنیٰ میں ہے اِس طرح سے ہے، کہ اسرائیل سے امام مراد ہیں اور بنی اسرائیل سے امام کے رُوحانی فرزند۔ یہ بات صرف اسرائیل اور بنی اسرائیل کے لفظوں سے متعلق نہیں ہے بلکہ ہر اُس پیغمبر کے ذکر میں یہی تاویل اور یہی معنی ہیں۔ مثال کے طور پر: ''وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ ''(۱۷:۷۰) ہم نے اولادِ آدم کو فضیلت و کرامت دی، اِس کی تاویل کے دو مقام ہیں، پہلا مقام یہ ہے کہ صحیح معنوں میں اولادِ آدم انبیاء و ائمہؑ ہیں تو خداوندِ عالم نے اُن کو فضیلت و کرامت دی، دوسری تاویل اِس میں یہ ہے کہ زمانے کا آدم امام ہے، خلیفۂ خدا کے معنی میں، ہادیٔ برحق کے معنی میں، حامل نور کے معنی میں اور رُوحِ خدا کے معنی میں، لہٰذا بنی آدم سے امام کے رُوحانی فرزند مراد ہیں، علیٰ ھٰذا القیاس۔ اب جتنے انبیاء علیھم السّلام کا ذکر قرآن میں ملتا ہے اُن سب کی تاویل کے یہی دو مقام ہیں۔ پہلے مرحلے پر اُن کا اپنا ذکر ہے اور دوسرے مرحلے میں ہادیٔ زمان کا اُس میں ذکر ہے، جیسے عام طور پر اسماعیلی کہا کرتے ہیں کہ زمانے کا عیسیٰ، زمانے کا موسیٰ، زمانے کا نوح، اور زمانے کا ہادی وغیرہ۔ صرف نبوّت کو اور صاحبِ شریعت ہونے کو یہ لفظ ممنوع ہے، لیکن جہاں نور کے معنی میں ہے، جہاں خلافت کے معنی میں ہے، جہاں ہدایت کے معنی میں ہے، جہاں وارث کے معنی میں ہے، جہاں معلمِ قرآن کے معنی میں ہے، تو اِن معنوں میں امامِ برحق جو ہے وہ زمانے کا ہادی ہے اور تمام حضراتِ انبیاء کے تذکروں میں یہی تاویل پوشیدہ ہے، اور اِس تصور میں آپ کو ہمیں بہت برکت ہے یعنی اِس سے آپ بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں، اور سمجھا سکتے ہیں، اور یہ ایک بہت بڑا کلیہ ہے، یہ ایک بہت بڑا قانون ہے۔ لہٰذا یہاں جس شان سے بنی اسرائیل کو نوازنے کا ذکر ملتا ہے، اُس کا تاویلی تعلق زمانے کے مومنین سے ہے کہ خداوندِ عالم احسان رکھتا ہے اِس بات کا کہ جس طرح دنیا میں مومنین کو کمزور سمجھا جاتا ہے اور اُن کو تعداد کے لحاظ سے بہت ہی کمتر مانا جاتا ہے اور بعض دفعہ اِن کو اذیت بھی دی جاتی ہے اور اِس کی بھی بہت سی مثالیں ہیں ہر زمانے میں، اور ہر ملک میں، تو اِس کے عوض میں خداوندِ عالم یہ فرماتا ہے کہ ہم نے اُن کمزوروں کو عالمِ عقل کے مشارق و مغارب کا وارث قرار دیا جس میں ہم نے بہت سی عقلی، علمی برکتیں رکھی ہیں، اور ہم نے نیکی کو، احسان کو بنی اسرائیل پر تمام کر دیا، تو آپ دیکھتے ہیں کہ میراث کے موضوع میں کتنی عظیم حکمتیں ہیں، اب ہم یہاں سے کسی اور آیت کی طرف جاتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے کہ: ''وَ اِنَّا لَنَحۡنُ نُحۡیٖ وَ نُمِیۡتُ وَ نَحۡنُ الۡوٰرِثُوۡنَ ''(۱۵:۲۳) ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں، اور ہم ہی وارث ہیں۔ دنیاوی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دنیا میں گزرتا ہے، تو اُس کے خاندان والے اُس کی جائیداد کو سنبھالتے ہیں، جائیداد کے مالک بن جاتے ہیں۔ خداوندِ عالم نے ایسا کیوں فرمایا کہ وہ لوگوں کے وارث ہیں، یہ رُوحانیت کے معنی میں ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رُوح کے مقابلے میں جسم ایک حقیر چیز ہے پھر بھی یہ جسم دنیاوی طور پر بہت سی جائیداد اور زمین، گھر، بار، بہت کچھ آل اولاد ایسی بہت سی چیزیں رکھتا ہے جسم، تو کیا

رُوح جو ایک روشنی ہے اور ایک اعلیٰ حقیقت ہے، کیا اُس کی کوئی جائیداد نہیں ہے، اُس کا کوئی مال نہیں ہے، اُس کی اولاد نہیں ہے، اُس کا گھر بار نہیں ہے، بہت کچھ ہے! بہت کچھ ہے! لیکن اگر کوئی شخص رُوحانی طور پر ہلاک ہوگیا تو پھر اُس کی تمام رُوحانی جائیداد رہ جاتی ہے، کوئی وارث نہیں، سوائے خدا کے اور رُوحانی طور پر رُوح کی جو کچھ جائیداد ہے، مال رملک ہے اور بہت سی چیزیں ہیں، تو وہ خدا کے لئے رہ جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک جماعت ہے، ایک مذہب ہے جو رُوحانی طور پر ہلاک نہیں ہوتا ہے اور باقی سارے ہلاک ہوجاتے ہیں، جب ہلاک ہوجاتے ہیں، تو اُن کی ساری جائیدادیں خدا کی ملکیت بن جاتی ہیں اور پھر خداوندِ عالم یہ ساری جائیدادیں، رُوحانی اشیاء مومنین کے نام پر کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی بادشاہ کسی ملک کو لیتا ہے، تو وہ اپنے مخالف کو، دشمن کو ہلاک کر ڈالتا ہے اور بڑی بڑی شخصیتوں کو قتل کرتا ہے، اُن کو غارت کر دیتا ہے، تباہ کر دیتا ہے، اور باقی کو مغلوب کر دیتا ہے، کوئی ڈر کے مارے اُس کے لئے تابعداری کرتا ہے، کوئی قید و بند سے دوچار ہوجاتا ہے، اور بہت سارے اُس کے غلام بن جاتے ہیں۔ اِسی طرح یہ جو فاتح بادشاہ ہے، مفتوح اور مغلوب کی ساری جائیداد کو اپنے قبضے میں کر لیتا ہے ظاہری مثال میں۔ اِس طرح رُوحانیت میں بھی ایک جنگ ہے، ایک مقابلہ ہے، تو اِس رُوحانی جنگ میں بہت سے لوگ شکست کھاتے ہیں، ہار جاتے ہیں اور پھر وہ پراپرٹی کے طور پر خدا کے اور مومنین کے ہوجاتے ہیں، اِس معنی میں خدا نے کہا کہ ہم ہی وارث ہیں پھر رُوحانی طور پر ساری جائیداد، ساری سلطنت اور ساری مملکت خدا کے قبضۂ قدرت میں جاتی ہیں اور پھر خداوندِ عالم یہ سب چیزیں جو خود بے نیاز ہے، مومنین کو عطا کر دیتا ہے۔

اُسی کے مطابق یہاں پر ایک اور آیت ہے، ارشاد ہے: ''اِنَّا نَحۡنُ نَرِثُ الۡاَرۡضَ وَمَنۡ عَلَیۡهَا وَاِلَیۡنَا یُرۡجَعُوۡنَ ''(۱۹:۴۰) ہم ہی زمین کے وارث ہیں اور زمین پر جو بستے ہیں اُن کے بھی وارث ہیں، اور سب کو لوٹ کر ہماری طرف آنا ہے۔ یہاں پر کسی ایک فرد کا ذکر نہیں ہے، کسی ایک قوم کا ذکر نہیں ہے، من حیث المجموع، سب کا ذکر ہے اور یہاں تک کہ ایک طرح سے مومنین کا بھی اِس میں ذکر ہے۔ سب کی رُوحانیت، سب کی رُوحیں اور سب کی رُوحانی جائیداد خدا کی ملکیت بن جاتی ہے اور سب کو لوٹ کر خدا کے حضور جانا ہوتا ہے لیکن اِس میں فرق کیا ہے، پھر مومنین کو خداوندِ عالم چونکہ ہلاک نہیں کر ڈالتا ہے بلکہ اُن کو اپنی ذات میں زندگی عطا فرماتا ہے۔ اپنے اوصاف میں اُن کو زندہ کر دیتا ہے۔ لہٰذا ساری زمین کے مالک اور زمین رُوحانیت کے مالک اور رُوحانی جائیدادوں کے مالک مومنین ہی قرار پاتے ہیں۔

اِسی میراث کے سلسلے میں اور وارث کے سلسلے میں حضرت زکریا علیہ السّلام نے ایک اولاد کی خواہش میں دعا کی اور عرض کرتے ہوئے کہا: ''وَزَکَرِیَّاۤ اِذۡ نَادٰی رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرۡنِیۡ فَرۡدًا وَّاَنۡتَ خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ (۸۹:۲۱) زکریا نے پکارا اپنے پروردگار کو اور کہا کہ خداوندا! پروردگارا! مجھے اکیلا نہ چھوڑیئے اور تمام وارثوں سے تُو بہترین ہے۔ یہاں پر ذرا گہری حکمت کے ساتھ تاویل ہے، ظاہر میں اُنہوں نے ایک بیٹے کی دعا کی اور یہ دنیاوی طور پر نہیں تھا، دین

کے معاملے میں اپنے وارث کو چاہتے تھے، یہ دینی (sense) میں تھا لیکن اِس سے بڑھ کر ایک چیز کہ: ''اَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ'' تو اِس کا کیا مطلب؟ جب اُس نے'' خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ'' کا ذکر کیا تو اُس کو بہترین وارث ملنا چاہئے۔ اِس میں نور کا ذکر ہے، کہ جو نور ہے اُس میں خدا کی نمائندگی ہے اور وہی بہترین وارث ہے یعنی خدا خود ہی بہترین وارث ہے، اُس نے اپنے مقصد کو بہت ہی بلند رکھا، مقصد کو بہت ہی بلند رکھنا یہ دانشمندی ہوتی ہے، طلب کو چھوٹی بنانا یہ دانشمندی نہیں ہے، تو نور اُن کا وارث تھا اور نور خدا کا نمائندہ تھا اور نور ہی'' خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ'' تھا۔

یہاں پر ایک عالیشان آیت سامنے ہے اور بہت ہی عالی قدر ہے، تاویلی حکمتوں سے بھرپور ہے: ''وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصَّالِحُوْنَ ''(۲۱:۱۰۵) اور تحقیق ہم نے کتاب میں لکھا ذکر کے بعد، کہ زمین میرے نیک بندوں کی میراث قرار پائے گی۔ یہاں زبور سے کتاب مراد ہے اور وہ کتابِ رُوحانیت ہے، حقیقی مومن جب بندگی اور عبادت میں کامیاب ہوجاتا ہے، تو اُس کی رُوحانیت ایک کتاب قرار پاتی ہے ،اور اُس کے اشاروں میں مثالوں میں یہ لکھا ہوتا ہے، کہ نیک بندوں کو یعنی حقیقی مومنوں کو رُوحانی طور پر یہ زمین ملا کرتی ہے۔ یہ اُس کتابِ رُوحانیت میں لکھا ہوا ہوتا ہے، اُس کے اشاروں سے، اُس کے رموز سے، اُس کی مثالوں سے یہ پتہ چلتا ہے یعنی جو بندۂ مومن مراحلِ رُوحانیت میں کامیاب ہوجاتا ہے، تو اُس کی رُوحانیت ایک عملی کتاب قرار پاتی ہے اور اُسی کتاب میں خدا یہ لکھ دیتا ہے، کہ دیکھو جو بھی مومنین ہیں اُن کو اِس دنیا کی رُوحانی سلطنت ملے گی، وہ اِس زمین کے رُوحانی طور پر وارث قرار پائیں گے، ظاہر میں نہیں باطن میں۔ اِس دنیا والوں کی رُوحیں، اُن کی رُوحانی جائیداد اور اُن کا سب کچھ! سب کچھ! لیکن ایک سوال آپ ہم سے کرسکتے ہیں، یہاں'' صَالِحُوْنَ'' کے لفظ کے آنے کا کیا مقصد ہے؟ جیسے مومنین کے بہت سے نام ہوسکتے ہیں کبھی متقین بھی آسکتا ہے اور کبھی عابدین بھی ہوسکتا ہے، مومنین بھی آسکتا ہے لیکن یہاں ''صَالِحُوْنَ'' اِس موقع پر کیوں آیا؟ دیکھیں! سب لوگ دنیا میں آئے مومن بھی آئے، دنیا والوں نے اعمال جو کچھ بھی کیا، کیا لیکن یہ خدا کے منشاء کے مطابق آخری مرحلہ نہیں ہے، اِس میں بہت کچھ اصلاح باقی ہے۔ اصلاح، یہ ''صَالِحُوْنَ'' میں اصلاح کے معنی ہیں (reformation)، تو رُوحانی طور پر مومنین (reformation) کریں گے وہ مصلحین ہیں۔ خدا اِن کو یہ زمین رُوحانی طور پر یوں نہیں دیتا ہے، کسی مقصد کے پیشِ نظر دیتا ہے، وہ اپنی دعوت کو پھیلائیں گے اور دنیا والوں کو دینِ حق میں پکاریں گے، لائیں گے، وہاں ایسا نہیں ہے کہ پھر وہ قبول نہیں کریں گے وہاں کرامات ہیں امام کے، معجزات ہیں، دلائل ہیں، علم ہے۔ پھر اُن کو احساس بھی ہوگا، سزا بھی مل چکی ہوگی اور اُن کو جہنم سے ایک بار نکالنا ہوگا اِس کے بعد اُن کو دین سکھانا ہوگا، اور دعوتِ حق اُن کے سامنے پیش کی جائے گی، یہ ہے ''صَالِحُوْنَ'' کے معنی، اِسی مقصد کے پیشِ نظر سب دنیا والے جو ہیں مومنین کے سپرد ہوجائیں گے۔ مگر اِس میں ایک

بات نہ بھولیئے گا کہ لوگ ایک بار جہنم میں داخل ہو چکے ہوں گے، کون سے جہنم میں؟ جہالت و نادانی کے جہنم میں اور پھر اپنے کئے کی سزا پا چکے ہوں گے اور پھر خداوند کی رحمت سے اور مومنین کی سفارش سے اُن کو وہاں سے نکال کر اور ایک رُوحانی جنگ بھی ہوگی تو اِس کے نتیجے میں وہ شکست خوردہ ہوں گے پھر ایک بار مر بھی چکے ہوں گے، بہت کچھ ہوگا جس کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے۔ پھر اُس کے بعد اصلاح ہوگی زمین میں، اِسی اصلاح کے لئے سب لوگ مومنین کے سپرد ہو جائیں گے۔

''اِنَّ فِیْ ھٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِیْنَ''(۲۱:۱۰۶) ارشاد ہوتا ہے کہ یہ پیغام یہ (message) کسی کو نہیں، جو صحیح معنوں میں عبادت گزار ہیں اُن کو پہنچانا ہے۔ چونکہ یہ بہت ہی شاندار آیت ہے اِس لئے میں اِس کو دوبارہ پڑھ کر سناتا ہوں: ''اِنَّ فِیْ ھٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِیْنَ''۔ اِس واقعے کا (message)، پیغام اُن کو سنانا ہے جو عبادت گزار ہیں تا کہ وہ اور زیادہ عبادت کریں۔ خدا اور رسول اور صاحبِ امر کے منشاء کے مطابق جو عبادت گزار ہیں اُن کو یہ پیغام سنانا ہے، اُن کو بتانا ہے، اُن کو سمجھانا ہے تا کہ وہ خود کو اِس کے لئے تیار کریں، علمی طور پر تیار کریں۔ کیونکہ یہ اصلاح اور کسی چیز سے نہیں ہے علم سے ہے اور لوگ کسی اور طرح سے کمبود [فارسی: کمزور] نہیں ہوئے ہیں، وہ نظریات میں، علم میں، حقیقت میں، معرفت میں اُن کی کمی رہی ہے۔ اُن کی اِس کمی کو دور کرنے کے لئے، اُن کو سمجھانے کے لئے، سکھانے کے لئے خود کو علمی طو پر تیار کرنا ہے اور خدا ارشاد فرماتا ہے: ''اِنَّ فِیْ ھٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِیْنَ''(۲۱:۱۰۶) جو خدا اور رسول اور امام کے منشاء کے مطابق عبادت گزار لوگ ہیں اُن کو بتانا ہے تا کہ وہ اور شاندار طریقے سے عبادت کریں اور علم سے خود کو آراستہ کریں۔

بنی اسرائیل کے بارے میں ایک اور شاندار آیت سامنے ہے، خدائے جلیل و جبار ارشاد فرماتا ہے: ''وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَھُمْ اَئِمَّۃً وَّنَجْعَلَھُمُ الْوَارِثِیْنَ ۝ وَنُمَکِّنَ لَھُمْ فِی الْاَرْضِ وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ وَھَامَانَ وَجُنُوْدَھُمَا مِنْھُمْ مَّا کَانُوْا یَحْذَرُوْنَ'' (۲۸:۵۔۶) اللہ پاک ارشاد فرماتا ہے کہ اور ہم چاہتے ہیں کہ احسان کریں اُن لوگوں پر جن کو زمین میں کمزور قرار دیا گیا ہے، اُن پر ہم احسان کرنا چاہتے ہیں اور یہ احسان کرنا چاہتے ہیں کہ اُن کو ہم امام بنائیں اور اُن کو وارث بنائیں۔ آپ کو کبھی یاد ہوگا ہم نے کہا تھا کہ بنی اسرائیل سب، ہر فرد، اپنے وقت کے امام میں امام تھا، اور دنیا میں امام کے دو کروڑ اسماعیلی ہیں اور اِن میں سے ہر ایک کی رُوح اِس طرح سے ہے کہ ایک سرا امام کی ذات میں ہے اور دوسرا سرا اُس کی شخصیت میں ہے۔ بندۂ مومن کی رُوح کا جو سرا امام کی ذات میں ہے وہ امام کی ہستی سے مل کر ہے، اِس معنیٰ میں ہر مومن ایک سرے سے امام ہے، امام کا جزو ہے، امام کا رُوحانی فرزند۔ جب مومن اِس جسم کو چھوڑے گا تو یہ حقیقت اور زیادہ اُجاگر ہو جائے گی کیونکہ اِس جسم سے دُوری کا پتہ چلتا ہے، دُوری کا سبب ہو جاتا ہے اور اگر جسم چھوڑیں اور اِس

رُوح کے ساتھ ساتھ اصل سرچشمہ پر جائیں، تو وہاں پر بندۂ مومن امام سے وابستہ ہے۔ اِس کی مثال یا تو سورج سے دے سکتے ہیں یا کسی بڑے چشمے سے، اگر سورج سے مثال دینی ہے تو لیجئے کہ سورج سے لاتعداد کرنیں پھوٹ رہی ہیں اور وہ کرنیں زمین تک پہنچی ہوئی ہیں، آپ کسی ایک کرن کو سمیٹتے سمیٹتے سورج کے سرچشمے تک جائیں، تو آپ دیکھیں گے کہ یہ کرن سورج کی ذات میں ہے، ٹھیک! پھر اِسی طرح دنیا میں کوئی پانی کا بڑا سرچشمہ ہے، اِس سرچشمے سے سینکڑوں نہریں بہہ رہی ہیں، دُور دُور تک، آپ کسی بھی ایک نہر پر کھڑے ہو جائیں اور پانی کے بہاؤ کے مخالف آپ چلیں، چلیں، چلیں، چلیں، وہاں چلیں جہاں پر یہ نہر ختم ہو جاتی ہے، تو ایک سرچشمہ ملتا ہے، پتہ چلے گا کہ یہ نہر اُس سرے میں، نہر نہیں ہے، خود چشمہ ہے، تو یہی حال بندۂ مومن کی رُوح کا بھی ہے، کہ یہ رُوح ایک بہنے والی (wave) ہے، لہر ہے یا کرن ہے یا ایک نہر ہے، تو خداوندِ عالم یہاں جو فرماتا ہے کہ ہم کمزوروں کو امام بنانا چاہتے ہیں، تو امام کتنے ہیں، ایک ہونا چاہئے نا! سینکڑوں امام تو نہیں ہوتے ہیں، ایک ہی امام ہے، تو جب مومنین اِس دنیا سے گزر جائیں گے تو اپنے آپ کو امام میں پائیں گے اور اُسی حیثیت میں اِس زمین کی اصلاح کریں گے بات ختم ہو گئی۔ اِس حقیقت کا سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے بڑا آسان ہے، اور اِس تصور کی تصدیق میں آپ کو کئی کئی فرامین مل سکتے ہیں حضرت مولانا امام سلطان محمّد شاہ صلوات اللہ علیہ کے، تو خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ جن مومنین کو اِس دنیا میں کمزور قرار دیا گیا ہے ہم اُن کو امام بنانا چاہتے ہیں اور اُن کو وارث بنانا چاہتے ہیں، رُوحانی طور پر اِس زمین کا، ''وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ'' (۶:۲۸) اور اِس زمین پر اُن کو امکانیت دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے دین کو دوسرے ادیان پر غالب کر دیں۔

''وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا'' (۲۷:۳۳) زمانۂ بنوت کے مومنین سے فرمایا جاتا ہے، کہ دیکھو مومنین! خدا نے تم کو کتنے مما لک پر فتح عنایت کر دی، اور اُن کی زمینوں کا ما لک قرار دیا، اُن کے گھروں کا، اُن کے اموال کا اور ایک ایسی زمین کا بھی اِسی کے ساتھ تم کو ما لک قرار دیا گیا کہ اُس زمین پر ابھی تو تم نے قدم نہیں رکھا۔ یہاں پر دو زمینوں کا ذکر آیا، ایک طرف سے ظاہری زمین کا ذکر آیا کہ کچھ علاقے، کچھ مما لک، کچھ جگہیں فتح کی گئیں اور وہاں سے اِن کو بہت کچھ مالِ غنیمت ملا، اور اِسی کے بہانے سے جو دوسری اصل زمین ہے اُس کا ذکر فرماتے ہوئے فرماتا ہے کہ ایک ایسی زمین اور دی کہ ابھی اُس پر تم نے قدم نہیں رکھا، یہ زمین رُوحانیت ہے تو زمین رُوحانیت کی فتح کا اِس میں ذکر ہے، اور خدا قادر ہے اِس لئے وہ یہ کام کر کے رہے گا۔

اِس آیۂ کریمہ میں کچھ حضرات کے وارثِ کتاب ہونے کا ذکر ملتا ہے اور وہ اِس طرح سے ہے: ''ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا'' (۳۲:۳۵) پھر ہم نے کتاب کے وارث قرار دیئے اُن بندوں کو جن کو

ہم نے اپنے بندوں سے منتخب کیا ہے۔ یہاں پر انتخاب در انتخاب ہے یعنی ایک انتخاب کے بعد اور پھر دوسرا انتخاب ہے کیونکہ "مِنۡ عِبَادِنَا" ہے، عوام سے انتخاب نہیں ہے، بلکہ پہلے تو عوام سے مومنین کا انتخاب ہے، اور پھر مومنین سے اماموں کا انتخاب ہے تو یہ اماموں کی شان میں ہے۔ سب سے پہلے حضراتِ ائمہ آسمانی کتاب کے وارث ہیں، چونکہ یہاں پر اماموں کا خاص طور سے ذکر آیا ہے لہٰذا تھوڑی سی وضاحت کی ضرورت ہے کہ امام کے وارثِ کتاب ہونے کے کیا معنی ہیں۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے کہ ہر کوئی دعویٰ کرتا ہے، کہتا ہے کہ یہ قرآن میرا ہے، میں اِس کو زیادہ صحیح سمجھتا ہوں اور پھر کوئی ریشمی غلاف بھی بنا کر اُس کو اچھی طرح سے عزّت سے اُٹھاتا ہے اور چومتا ہے، تعظیم کرتا ہے، اچھے سے اچھے حروف میں لکھتا ہے اور شائع کرتا ہے، یہ کرتا ہے، وہ کرتا ہے اور دوسرے کے بارے میں کہتا ہے کہ یعنی وہ تو کہاں قرآن کو جانتا ہے وہ تو قرآن کو نہیں جانتا ہے کیونکہ اُس کی ڈاڑھی نہیں ہے وغیرہ، ایسا کہا جاتا ہے۔ لیکن یہاں پر خداوندِ عالم کہتا ہے کہ اُس نے کچھ حضرات کو آسمانی کتاب کا وارث قرار دیا ہے۔ دنیا کی کوئی اور چیز ہوتی تو اُس کے وارث ہونے میں کوئی خاص معنی نہیں ہوتے، بس وارث کے یہ معنی ہیں کہ یہ چیز اُس کی ہے لیکن آسمانی کتاب کے وارث ہونے میں ضرور معنی ہیں اور وہ معنی یہ ہیں کہ قرآن کی اصل حقیقتیں یا تاویلی حکمتیں صرف وہی حضرات جانتے ہیں جو خدا کی طرف سے اِس کتاب کے وارث ہیں۔ یہاں اِس کتاب کے وارث ہونے کے یہی معنی ہیں اور اگر یہ بات ہے، تو ہمیں اور زیادہ تلاش کرنا چاہئے کہ وہ حضرات کس طرح جانتے ہیں، کیا اُن کا آپس میں کوئی ایسا مکتب ہے جس میں چپکے چپکے سے جا کر پڑھتے ہیں یا کوئی ایسا قلعہ ہے کہ اُس میں خاص خاص کتابیں جو ہیں چھپائی ہوئی رکھیں ہیں، کیا بات ہے، نہیں! یہ تو رُوحانیت کی بات ہے جس طرح خدا نے فرمایا کہ تمہارے پاس نور آیا ہے اور کتاب آئی ہے (۵:۱۵) تو زمانۂ نبوّت میں جو معلمِ قرآن تھا اُس کا ایک نام نور تھا، اور ایک اور نام رُوح تھا۔ چنانچہ یہ حضرات قرآن کے نور ہیں اور قرآن کی رُوح ہیں، لہٰذا اِن کی تعلیمات رُوحانی طور پر ہیں وہ اگر کسی کو سکھانا بھی چاہیں تو رُوحانی رستے سے سکھاتے ہیں اور امام معلمِ قرآن رُوحانی (sense) میں ہیں ظاہری طور پر نہیں، ظاہری طور پر ہوتا تو امام کا کوئی ایسا خاص مکتبِ قرآن ہوتا یا مدرسۂ قرآن ہوتا اور اُس میں گرامر اور الفاظ اور عربیت اور اِس قسم کی باتیں چلتیں، کسی زمانے میں ایسا نہیں ہوا اور جو ہوا بھی بہت تھوڑا ہوا۔ مثلاً حضرت امام جعفر الصادقؑ کے زمانے میں اور اِس سے آگے اور بعد میں بہت تھوڑا ہوا ظاہری طور پر درس و تدریس کا کام، ورنہ ظاہری طور پر کچھ نہیں ہوا اور ظاہری طور پر ہونے کی کیا ضرورت ہے جب خدا کا منشاء ہی ایسا ہے کہ باطنی پہلو سے کام ہوتا رہے اور خدا یہ بھی چاہتا ہے کہ ایک طرح سے پردہ بھی رہے، تو خدا کے پروگرام اور اُس کے منشاء کے خلاف کوئی کام کیوں ہو، تو اللہ کے حضور سے کچھ حضرات کے وارثِ کتاب ہونے کے یہ معنی ہیں کہ قرآن کی حقیقتیں اور قرآن کی رُوح، قرآن کی تاویل اُن کے پاس ہے۔

آج اسلام میں جتنے فرقے ہیں اُن کے مقابلے میں اسماعیلی مذہب میں قرآنی حکمتوں کے بہت سے خزانے باطن سے ظاہر میں آچکے ہیں۔ پھر بھی قرآن کے باطن میں جو جواہر ہیں وہ ختم نہیں ہوئے، تاہم دوسروں کے مقابلے میں جو کام ہوا ہے قرآن پر وہ بہت زیادہ ہوا ہے، اِس کی وجہ کیا ہے؟ اِس کی وجہ یہی ہے جو ہمارے سامنے ہے کہ امام وارثِ قرآن ہیں اور قرآن امام کی پراپرٹی ہے، تاریخ کے اعتبار سے بھی، قرآن کی روشنی میں بھی اور صورتِ حال کو بھی دیکھئے کیونکہ صورتِ حال بھی ایک حقیقت ہے۔ آپ موازنہ کریں، دیکھیں تمام فرقوں نے قرآن کے متعلق بہت کوششیں کیں لیکن آپ کے پاس اگر کوئی ترازو ہے تو تولیں، مگر آپ اِس طرح سے کبھی نہیں تولنا کہ آپ ضخامت کو اور کتاب کے وزن کو تولیں، (essence) کو تولیں اگر آپ کے پاس کوئی معیار ہے تو، اور ضرور ہے آپ کے پاس، آپ تول سکتے ہیں، جائزہ لے سکتے ہیں۔ ایک بہت بڑی ضخیم کتنی کتنی جلدوں میں ایک تفسیر کو اُٹھائیں، اور اسماعیلی مذہب کی ایک چھوٹی سی کتاب کو کسی بھی اسماعیلی بزرگ کی، امام کا کسی کے ساتھ مقابلہ نہیں ہے، کسی مرید کی ایک چھوٹی سی کتاب کو لیں، دیکھیں۔ اُس چھوٹی سی کتاب میں جو دلائل ہوں گے، جو روشنی ہوگی، جو جواہر ہوں گے اُن کی کوئی قیمت نہیں ہوسکتی ہے۔ ہمیں جب بصیرت ملی ہے، تو ہم کاغذ کو کیوں تولیں گے، کل ایک آیت ایسی ملی تھی کہ اُس میں عیسائیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ اُس کا مفہوم اِس طرح سے ہے کہ جن لوگوں نے تورات کو اُٹھایا پہلے تو اُٹھایا اور پھر نہیں اُٹھایا، سو اُن کی مثال گدھے کی سی ہے، جس پر بہت ساری کتابیں لادھی گئیں (۵:۶۲) کیا معنی اِس کے؟ عیسائیوں نے (accept) کیا انجیل کو تو یہ ہوا اُٹھانا اور اِس کے رموز کو نہیں سمجھا، اِس کی حکمتوں کو نہیں سمجھا یہ ہوا نہ اُٹھانا، تو پہلے معنی میں گدھا بھی اُٹھا سکتا ہے، اُٹھانا تب ہے جب دوسرے معنی میں کوئی اُٹھائے، تو پھر ایک دم سے خدا نے گدھے کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ دیکھو ایک گدھا ہے اُس پر بہت ساری کتابیں لادھی گئی ہیں۔ پھر فرماتا ہے کہ ظالم قوموں کی مثال بہت بُری ہے کہ اُن کی مثال گدھے سے ملتی جلتی ہے، اسماعیلی مذہب میں بھید ہیں، خدا کے بھید، جواہر ہیں۔ یہ لفظ صرف کہنے کے لئے نہیں ہے، واقعاً جواہر ہیں لیکن کون سے جسمانی نہیں، رُوحانی اور عقلی جواہر جسم کی کیا اہمیت۔

یہاں پر ایک اور آیت سامنے ہے، جنّت والے کہیں گے: ''وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِیْنَ'' (۳۹:۷۴) وہ کہیں گے اللہ کی تعریف ہے کہ اُس نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ سچّا کر کے دکھایا اور اُس نے ہمیں زمین کا مالک قرار دیا اور جنّت سے ہم دنیا کے ساتھ رابطہ رکھتے ہیں اور زمین میں جہاں چاہتے ہیں اپنے لئے ٹھکانا بناتے ہیں۔ اِس آیت میں جنّت کے ساتھ ساتھ اِس دنیا پر بھی تسلط ہونے کے معنی ہیں اور اِس مقام پر میں یہ بھی عرض کروں کہ جنّت کا طول وعرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے (۳:۱۳۳) جنّت کا طول وعرض کتنا ہے؟ آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ آسمانوں اور

زمین کے رُوحانی پہلو کا نام جنّت ہے، کیا؟ اِس کائنات کے باطنی پہلو کا نام جنّت ہے ۔ چنانچہ سیارۂ زمین بھی جنّت کے زُمرے میں آتا ہے ۔ سیارۂ زمین کی رُوحانیت تمام لوگوں کا باطن اُن کی رُوحیں اور رُوحانی کیفیت یہ جنّت والوں کی پراپرٹی ہے، تو سارے دنیاوالوں کو وہ (use) کریں گے، اِن پر اُن کی حکومت چلے گی ۔

ارشادِ خداوندی ہے: ”وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْھُدٰی وَاَوْرَثْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ الْکِتٰبَ ۝ ھُدًی وَّذِکْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ“ (۴۰: ۵۳ ۔ ۵۴) اور ہم نے موسیٰ کو ہدایت دی اور بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث قرار دیا اور اسی کے ساتھ اُن کو ہدایت اور نصیحت بھی مل گئی ۔ ”ھُدًی وَّذِکْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ“ اِس میں عقل و دانش والوں کے لئے ہدایت ہے اور نصیحت ہے ۔ جس طرح ابھی ہم نے وضاحت کی تھی، کہ یہ بات صرف ایک زمانے کے لئے خاص نہیں ہے تمام زمانوں میں یہ بات ہے، کتاب بے شک کسی بڑے پیغمبر پر نازل ہوتی ہے لیکن وہ کتاب صرف پیغمبر کی ذات کے لئے نازل نہیں ہوتی ہے، صرف اُس کے خاندان والوں کے لئے نازل نہیں ہوتی ہے، نازل ہوتی ہے پیغمبر پر، لیکن مومنین کے لئے اور سب سے پہلے وارث کتاب کے پیغمبر کے جانشین ہیں یعنی امام، اور پھر اِس لئے کہ امام مومنین کا رُوحانی باپ ہے، لہٰذا باپ کی پراپرٹی بیٹوں کے نام پر ہوتی ہے، اِس لئے جہاں آسمانی کتاب امام کی میراث ہے اور جہاں امام ہی وارث ہیں، تو وہاں امام کے بعد اُس کے روحانی فرزند اِس کتاب کے وارث ہیں، اور اِس کا ثبوت یہ ہے کہ آج قرآن مومنین کا (favour) کرتا ہے، مومنین ہی اِس کے مطالب کو بہتر سمجھتے ہیں، اِس کی حکمتوں سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور مومنین ہی کی تعریف ہے قرآن میں ۔ لہٰذا قرآن مومنین کا ہے اِس لئے کہ اُن کے رُوحانی باپ کا ہے ۔ یہ مقدّس میراث مومنین کی ہے، اِس لئے اُن کو مزہ آتا ہے، اِس لئے اِس میں اُن کی تعریف ہے، اُن کے امام کی تعریف ہے، اُن کے مذہب کی تعریف ہے، اُن کے نظریے کے مطابق ہیں اِس کی جملہ حکمتیں، اُن کے لئے آسان ہے، اُن کے لئے کوئی دشواری نہیں ہے، تو اِسی کے ساتھ میں آج کی کلاس کو ختم کرتا ہوں اور میں باقی وقت آپ کے لئے رکھتا ہوں، آپ جو چاہیں اِس سلسلے میں کوئی سوال اُٹھانا چاہیں تو بے شک ایک ایک کر کے سوال کر سکتے ہیں، شکریہ ۔ دلچسپی کے طور پر یا جس طرح سے چاہیں سوال کر سکتے ہیں، اگر کوئی سوال نہیں ہے تو کوئی حرج نہیں ہے ۔ چونکہ یہ مختلف آیات پر مبنی موضوع تھا اور اِس میں کافی وضاحتیں ہوئی ہیں اور آئندہ ہم (topic)،(subject wise) گفتگو کریں تو اچھا ہے ۔

سوال: [(امین رحمانی) سر! اِسی موضوع سے متعلق وصیت کا (topic) آتا ہے وراثت کے سلسلے میں، اُس پر تھوڑی سی آپ روشنی ڈالیں گے ۔ مہربانی سر] ۔

جواب: ایک دن ہماری گفتگو رہی تھی اُس میں شاید آپ تھے یا نہیں تھے اور آپ شاید سب کی بھلائی چاہتے ہوں گے ۔ بہر حال سوال بہت عمدہ ہے اور عاقلانہ سوال ہے، اِنہوں نے وصیت کے بارے میں سوال اُٹھایا جو اِس

موضوع کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، (related) ہے ۔ بڑا عمدہ سوال ہے، تو اُس کے لئے میں عرض کروں گا کہ اگرچہ ہمارے بعض بھائیوں نے یہ خیال کیا کہ حضورِ اکرمؐ نے جانشینی کے سلسلے میں کوئی خاص وصیت نہیں کی تھی کسی کے نام پر، یوں خیال کرتے ہیں، لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وصیت جیسے دین کے ایک بنیادی امر کو نظر انداز کریں ۔ حالانکہ آپ قرآن میں دیکھیں زمانۂ آدم سے لے کر آنحضرتؐ کے زمانے تک ہر پیغمبر نے اپنے جانشین کے لئے اہتمام کیا اور وصیت کی، اور وصیت کے بغیر کوئی پیغمبر دنیا سے رحلت نہیں کر گئے ۔ اِس کے علاوہ اسلام میں وصیت کی یہ حد ہے، وصیت کی نزاکت اور اُس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی کے پاس تھوڑی سی دنیوی مادّی جائیداد ہے، تو اُس کے لئے یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ اپنے بعد اُس جائیداد کی تقسیم میں کیا ہونا چاہئے ۔ کیا وہ عام طور پر شرعی انداز سے تقسیم ہو جائے گی یا کوئی قرض ہے یا کسی کے نام پر اُس جائیداد میں سے کچھ دینا ہے اور کتنی جائیداد دینی ہے اُس کی بھی حد ہے، تو یہاں تک دینِ اسلام میں اہتمام فرمایا گیا ہے کہ کوئی بھی مال جو کسی متوفّی کے بعد رہتا ہے، تو اُس کے متعلق صحیح صحیح وصیت ہونی چاہئے ۔ جہاں ایک مادّی شئ کے لئے یہ اہتمام فرمایا گیا ہے وہاں کارِ دین اور ہدایت، اسلام جو رسولؐ کی جائیداد ہے، اور قرآن جو رسولؐ کی سب سے بڑی جائیداد ہے، تو اُس کے متعلق وصیت نہ کرے اور اپنے وصی کو نہ قرار دے، تو یہ کیسے ہوسکتا تھا۔

آپ اِس میراث سے ذرا ہٹ کر وصیت کے موضوع کو لیں تو بہت سے حقائق کا پتا چلے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ وصیت کتنی اہم شئ ہے، تو اِس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ رسولؐ نے اپنے بعد وصی کو مقرّر فرمایا تھا اور اُنہوں نے وصیت کی تھی اِس معنی میں ہماری ایک مشہور اصطلاح ہے کہ علیؑ کو بہت پہلے وصی قرار دیا گیا تھا، اور اُس وقت مولا علیؑ بہت ہی چھوٹے تھے، اِس کو دعوتِ عشیرہ کہتے ہیں، تو رسولؐ نے ایک دن ایک چھوٹی سی دعوت کا اہتمام فرمایا تھا اور اُس میں اپنے اقربا کو دعوت دی تھی اور خاص طور پر اعلان فرمایا تھا کہ خدا کی طرف سے میں رسول ہوں، تو تم میں کون ہے جو میرا وصی ہونا چاہتا ہے، میرا وزیر ہونا چاہتا ہے اور میرا بھائی ہونا چاہتا ہے ۔ کیونکہ دنیا میں جتنے بھی رسول آئے ہیں اُن کا ایک بھائی تھا، ایک وصی تھا، ایک وارث تھا، اِس عنوان سے اور اِس کا ذکر ملتا ہے، تو اُس وقت باری باری سب سے پوچھا تو کسی نے کچھ نہیں جواب دیا اور مولا علیؑ نے جواب دیا کہ میں آپ کے لئے کام کروں گا، میں آپ کا بھائی ہوں، میں آپ کا وصی، تو یہ ہے کہ وصیت اسلام میں ایک بنیادی شئ ہے، رسولؐ نے وصیت کی تھی اور مولا علیؑ کو بہت پہلے وصی مقرّر کیا تھا۔ آپ کتابِ دعائم الاسلام کو لیجئے اُس میں یہ ذکر ملتا ہے ۔

سوال: (سر! آپ نے فرمایا کہ ایک بار لوگ جہنم میں جا چکے ہیں اور مومن کی دعا سے نکال دیئے گئے ۔ لوگ سے مراد کیا سب لوگ ہیں یا مومن سے مراد کوئی اور شخصیت ہے؟)

جواب: اِنہوں نے میری گفتگو کے حوالے سے پوچھا کہ لوگ ایک بار جہنم میں جائیں گے اور مومن اُن کے لئے

دعا کرے گا، دعا نہیں سفارش کرے گا، اور اِس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے یہاں دوزخ سے جہالت مراد ہے، جہالت و نادانی خود دوزخ ہے، تو رسولؐ کی حدیث سے ظاہر ہے کہ جو لوگ نادانی میں ہیں وہ جہنم میں ہیں اور کچھ عرصے کے بعد سب سے پہلے رسولؐ اور امامؑ کا منشاء ہوگا خدا کا قانون ہوگا، اور پھر مومنین بھی سفارش کریں گے، تو اِس میں مومن سے حقیقی معنی میں پیغمبر اور امام مراد ہیں لیکن اِس کے بعد پھر بہت سے جو مرید ہیں جو اطاعت گزار ہیں وہ بھی مومن ہیں۔ مومن کی جو بھی صفت ہوتی ہے وہ پیغمبر اور امام کے بعد ہوتی ہے اور اُن کے نقشِ قدم پر چل کر یہ صفت مومن کی بنتی ہے، اور یہ سفارش بھی اِس طرح سے ہے کہ رسولؐ اور امامؑ کی سفارش کے بعد مومنین بھی سفارش کریں گے کیونکہ سفارش ایک محدود شئ نہیں ہے۔ بہت وسیع چیز ہے۔ لہٰذا مومنین کی بھی خاطر داری ہوگی اور خدا اِن کو اختیار عنایت کرے گا، تو مومنین بھی سفارش کریں گے۔ لہٰذا اُس آتش جہالت سے لوگوں کو علم کی روشنی میں چھٹکارا دیا جائے گا اور پھر بہت سے لوگوں کو اِس طرح سے نجات ملے گی۔

ٹرانسکرائب: امین رحمانی نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ؒ کا پُرحکمت بیان
عنوان: سورۂ نجم آیت ۱ تا ۲۰ تک کی حکمتیں

کیسٹ نمبر: Q-49　　　　تاریخ: ۱/ ۳/ ۱۹۸۴ء کراچی

Click here for Audio

یا علی مدد! عزیزانِ من! آج ہم سورۂ نجم جو (۵۳) نمبر کا سورہ ہے، اُس کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اِس سورے میں حقائقِ معراج کا ذکر ہے، اِس لئے اِس سورے کی بہت بڑی اہمیت ہے۔

"بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ وَالنَّجۡمِ اِذَا ھَوٰی" (۱:۵۳) قسم ہے تارے کی جب گرے۔ آپ کو اِس حقیقت کا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ وہاں قسم کھاتا ہے جہاں کوئی بڑے راز کی بات ہوتی ہے اور یہاں ارشاد ہے کہ ستارے کی قسم جب وہ گرے، تو عقل پوچھتی ہے کہ یہ ستارہ کون سا ہے، جس کی اللہ تعالیٰ قسم کھاتا ہے اور جس کے گرنے کا ذکر فرماتا ہے۔ چنانچہ ستارے کے گرنے کی کئی تاویلات ہیں اور اُن میں سے کوئی ایک تاویل کہیں بیان ہوئی ہے اور یہاں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اِس کی ایک اور بڑی تاویل بیان کی جائے۔

اِس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جب جہانِ عقل یعنی عقلی عالم کا تصور ہوتا ہے یا اُس کے مشاہدے کی بات ہوتی ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں یعنی عالمِ عقل میں صرف ایک ہی چیز ہے جو وہی سورج ہے، وہی چاند ہے اور وہی ہر ستارہ ہے۔ پس یہ ستارہ جس کے گرنے کا بیان آیا ہے عقل کا ستارا ہے، اور اُس کے گرنے سے اُس کا مظاہرہ مراد ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ عالمِ عقل میں نورِ عقل کا ظہور ہوتا ہے اور نورِ عقل کا مظاہرہ ہوتا ہے، اُسی مظاہرے میں طلوع و غروب ہے اور اُسی میں دن رات کا مظاہرہ ہے، اور اُسی میں گرنے اور چڑھنے کی مثال پائی جاتی ہے، تو یہ عالمِ عقل کی بات ہے اور ستارۂ عقل کے گرنے کا ذکر ہے۔

اِس کے بعد آیت نمبر (۲) میں یوں ارشاد ہے کہ: "مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمۡ وَمَا غَوٰی" (۲:۵۳) اللہ جس مقصد کو ظاہر کرنے کے لئے قسم کھاتا ہے، وہ یہ بتانا ہے کہ تمہارا صاحب یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہ راہ سے بھٹکے اور نہ غلط راستہ ہو لیے، اور آپ جانتے ہیں کہ خدا کی باتیں چوٹی تک جاتی ہیں اور خداوندِ عالم آنحضرتؐ کے انتہائی عروج کا ذکر فرماتا ہے کہ جس طرح حضورِ انورؐ نے منازلِ رُوحانیت کو طے کیا اور جس شان سے آخری مقام کو پہنچے اُس میں حضورؐ نہ راہِ حق سے بھٹکے اور نہ غلط راستہ ہو لیے، اللہ اِس پر قسم کھاتا ہے، تو یہ حضورِ انورؐ کی رُوحانی معراج کا ذکر ہے۔

''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْـهَـوٰى ''(۵۳:۳)اور نہ آپ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بناتے ہیں ۔''اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى ''(۵۳:۴)اِن کا ارشاد صرف وحی ہے جو اِن پر بھیجی جاتی ہے،تو یہ شہادت بھی اِس قسم کے تحت ہے کہ خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے اور قسمیہ حکم دیتا ہے کہ حضورؐ اپنے نفس کی خواہش سے نہیں بولتے ہیں اور جو کچھ بھی آپ ارشاد فرماتے ہیں وہ سب کا سب وحی ہے جو حضورؐ پر نازل کی جاتی ہے ۔ اِس حکم کے تحت دو اُصول بنتے ہیں،ایک یہ کہ حضورؐ جب بھی بولتے ہیں،تو قرآن سے بولتے ہیں اور خدا کے کلام کو سناتے ہیں اور آیاتِ خداوندی کو بیان فرماتے ہیں ۔دوسرا اُصول یہ بنتا ہے کہ اِس کلام الٰہی کے علاوہ آپ اپنے طور سے بھی جو کچھ فرماتے ہیں،اُس میں بھی وحی کا اثر ہے ۔کیونکہ خدا نے آنحضرتؐ کے بولنے کو وحی کا درجہ دیا اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ کی صحیح حدیثوں کو بھی وحی کا درجہ دیا جاتا ہے اور اِن دونوں کلاموں میں یہ فرق بتاتے ہیں کہ جو قرآن ہے وہ لفظ بھی اور معنی بھی کلام ہے اور جو حدیث ہے،اُس میں معنی وحی ہے اور الفاظ آنحضرتؐ کے ہیں ۔ اِسی کے ساتھ ساتھ دوسرا قول بھی ہے اِس فرق کے سلسلے میں،وہ یہ کہ وحیٔ متلو اور وحیٔ غیر متلو ۔وحیٔ متلو کلامِ الٰہی ہے کہ وہ خدا کا کلام ہے اور کلام کے طور پر اُس کو پیش کیا گیا اور وحیٔ غیر متلو بھی کلامِ الٰہی ہے مگر اُس کا نام ارشادِ نبوی ہے،اِس معنیٰ میں کہ اُس کو آیاتِ قرآنی کے سلسلے میں پیش نہیں کیا گیا، بلکہ وقتاً فوقتاً اُس کو ارشاداتِ نبوی کے طور پر،حدیث کے طور پر پیش کیا گیا،حالانکہ اُس میں بھی وہی اثر ہے وہی معنی ہیں مگر الفاظ رسولؐ کے اپنے ہیں،یہ علمائے اسلام کا قول ہے ۔

اِس کے ساتھ ہم اپنے طور سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں،وہ یہ کہ آپ جب قرآن کو پڑھتے ہیں،تو قرآن میں کلام کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں کہ کہیں صیغۂ واحد میں آیت ہے،جیسے کہ خدا ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے ایسا کیا،کہیں صیغۂ جمع میں ارشاد ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ:''اِنَّهٗ يَقُوْلُ ''(۲:۷۱) یعنی پیغمبروں کی زبان سے بھی ارشادات ہیں،فرشتوں کی زبان سے بھی ارشادات ہیں،مومنین کی زبان سے بھی قصے ہیں،کافروں کی باتیں بھی ہیں اور شیطان نے جو کچھ کہا وہ بھی ہے مگر یہ سارا قرآن ہے اور کلامِ الٰہی ہے،کیونکہ یہ ساری ترجمانی زبانِ قدرت سے ہوئی ہے ۔اگرچہ کسی اور کا قصہ ہے یا کسی اور کی کہی ہوئی بات ہے لیکن اُس کی ترجمانی خدا نے کی تو اِس کو درجۂ کلام یا درجۂ قرآن ملا ۔پس جب صورتِ حال یہ ہے تو وہ صحیح حدیثیں جو واقعاً رسولِ اکرمؐ کے ارشادت میں سے ہیں تو لازمی طور پر جزوِ وحی ہیں اور اِسی لئے مولائے روم نے کہا کہ:''گرچه قرآن از لبِ پیغمبر است هر که گوید حق نه گفت آن کافر است''ہر چند کہ قرآن رسولؐ کی زبان سے واقع ہوا ہے لیکن جو کہے کہ خدا نے نہیں فرمایا تو وہ شخص کافر ہے ۔ بہر حال ہم اِس آیت کی تشریح کر رہے ہیں کہ:''اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى ''(۵۳:۴)،رسولؐ اپنی ذات سے،اپنے نفس سے نہیں بولتے ہیں بلکہ یہ سب کچھ وحی ہے جو آنحضرتؐ قرآن کے طور پر اور حدیث کے طور پر ارشاد فرماتے ہیں ۔

اِس کے بعد ارشاد ہے کہ: ''عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ''(۵:۵۳)، اُس کو یعنی آپ کو، آنحضرتؐ کو سخت قوت والے نے سکھایا ہے۔ یہ کون ہے سخت قوت والا؟ بہت سارے علما کے نزدیک، مترجمین کے نزدیک یہ جبرائیل فرشتہ ہے اگرچہ یہ صحیح ہے لیکن اِس کا اشارہ خدا کی طرف ہے، ''شَدِيْدُ الْقُوٰى ''یا گرچہ جبرائیل کو کہا بھی جائے لیکن جبرائیل تو ایک وحی کو لے کر آتے تھے، اصل سکھانے والا خدا تھا اور اِس کے علاوہ اُس مقامِ اعلیٰ پر جس ہستی کا ظہور ہوتا ہے اُس کا بھی ذکر آئے گا، وہ ہستی ایسی ہے کہ سب کی نمائندگی کرتی ہے۔ لہٰذا اُس کو جبرائیل مانیں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن اصل مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کہ وہی '' شَدِيْدُ الْقُوٰى '' ہے۔ ''ذُوْ مِرَّةٍ ''(۶:۵۳)، وہ صاحبِ قوت ہے۔ ''فَاسْتَوٰى '' (۶:۵۳)، پس پورا نظر آیا۔ یہ واقعۂ معراج ہے، تو رسولؐ نے وہاں پر مبدِع اور مبدَع کو دیکھا، عقلِ کُل کو دیکھا، نفسِ کُلی کو دیکھا، خدا کو دیکھا، جبرائیل کو دیکھا، اپنی حقیقت کو دیکھا، کیونکہ وہاں پر تمام حقیقتیں یکجا ہیں۔

''وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ''(۷:۵۳)، اور وہ اُس وقت بلند کنارے پر تھے یعنی آنحضرتؐ رُوحانیت کے بلند ترین کنارے پر پہنچے ہوئے تھے۔ جیسا کہ اُوپر کہا گیا کہ: ''مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ''(۲:۵۳)، اُس وقت فرمانا چاہئے کہ جبکہ سفرِ رُوحانیت ختم ہو جاتا ہے، تو تب خدا نے قسمیہ ارشاد فرمایا کہ شروع سے لے کر آخر تک تمہارا صاحب، تمہارا ساتھی نہ بھٹکے اور نہ غلط رستے پر ہو لیے، تو آنحضرتؐ رُوحانیت کے مقامِ آخرین پر پہنچے ہوئے تھے، اُس کا ذکر ہوا۔ ''ثُمَّ دَنَا ''(۸:۵۳)، پھر نزدیک ہو گئے۔ ''فَتَدَلّٰى ''(۸:۵۳)، پھر اُتر آئے۔ یعنی اُس وقت آپؐ ایک مثال کے مطابق اصل سے واصل ہو گئے اور اپنی حقیقت کو پالیا۔ خداوند کا دیدار ہوا اور دوسری مثال میں نفسِ کلی کی رُوئیت ہوئی یعنی دیدار ہوا، ملاقات ہوئی۔ ''فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ''(۹:۵۳)، پس اُس وقت دو کمانوں کی مسافت رہ گئی تھی بلکہ اُس سے بھی زیادہ قرب حاصل ہوا۔ یہ دو کمانوں کی مسافت کیا ہے اِس پر بھی صوفیائے کرام اور دیگر علما اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں۔ اِس سلسلے کی ایک تشریح تو یہ ہے کہ دو کمان سے دو نصف دائرے مراد ہیں اور دو نصف دائروں کے ملنے سے دائرہ بن جاتا ہے۔ ایک دائرے کا نام ربوبیت ہے یعنی ربّ کی ربوبیت۔ دوسرے دائرے کا نام عبودیت ہے یعنی عبد کی عبودیت۔ اگر یہ دو دائرے، دو نصف دائرے، (half circles)، ایک دوسرے کے آمنے سامنے بنائیں، تو نیچے سے اُوپر نصف دائرہ عبودیت کے اِس سرے سے اُس بلند ترین سرے تک جائیں تو وہ بلند ترین سرا اُفقِ اعلیٰ کہلاتا ہے جو دوسرے نصف دائرے سے مل جاتا ہے، اور اِن دو کمانوں کی دوسری تاویل بھی تقریباً اِس جیسی ہے، یہ کہ ہاتھ کو دہن کی طرف لے آئیں، تو یہ ایک قوس بن گیا اور پھر اُس کو واپس لے جائیں تو دوسرا قوس بن گیا، دو کمانوں کو ملانے سے دائرہ بن گیا۔ یہ قابِ قوسین کی بات ہے یا اُس سے بھی زیادہ نزدیک کا مطلب ہے کہ بلکہ وہ دو قوس نہیں تھے صرف ایک ہی دائرہ تھا جو دائرۂ لاابتدا اور لاانتہا تھا کہ اُس کا نہ تو کوئی آغاز ہے اور نہ ہی کوئی انجام۔ ''فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ''

(۵۳:۱۰)،سوخداوند نے اپنے بندۂ خاص پر جو کچھ وحی کرنا چاہئے وہ وحی کر دیا۔ یہاں پر ظاہر نہیں ہے کہ کیا وحی کی گئی لیکن خداوند ارشاد فرماتا ہے کہ خداوند نے اپنے بندے کو وحی کی جو کچھ کہ وحی کرنا چاہئے یعنی ایک اشارہ فرمایا جس میں تمام اشارے سموجاتے ہیں، جس میں سارا علم سموجاتا ہے اور یہ کلمۂ باری تھا۔

''مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى''(۵۳:۱۱)، وہاں جو کچھ دیکھا گیا اُس کی بابت دل نے جھوٹ نہیں بالا۔ جو مشاہدہ ہوا اُس کی بابت دل نے جو کہا وہ سچ کہا۔''اَفَتُمَارُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى''(۵۳:۱۲)، خداوندِ عالم لوگوں سے سوال کرتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کہ کیا تم جو کچھ اُس نے دیکھا اِس پر جھگڑتے ہو۔ یعنی خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ کیا تم اختلاف کرتے ہو جو کچھ اُس نے دیکھا تھا۔ واقعاً لوگوں کے درمیان اِس سلسلے میں اختلاف ہے، واقعۂ معراج ایک ایسی حقیقت ہے کہ وہ اپنی بلندی اور انتہائی پوشیدگی کی وجہ سے لوگوں کی رسائی سے بالاتر ہے۔ لہٰذا اُس کے بارے میں لوگ اختلاف کرتے ہیں، اِس لئے کہ وہ ظاہر نہیں ہے۔

''وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى''(۵۳:۱۳)، اور پیغمبر نے اِس واقعہ کو دوبارہ بھی دیکھا یا اِس دیدار کو دوبارہ بھی حاصل کیا۔''عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى''(۵۳:۱۴)، سدرۃ المنتہیٰ کے قریب، تو پہلے بھی سدرۃ المنتہیٰ کے قریب یہ واقعہ پیش آیا تھا اور سدرۃ المنتہیٰ کا مطلب ہے ایک ایسا بیری کا درخت جو منازلِ رُوحانیت کی انتہا پر واقعہ ہے، تو یہ دیدار وہاں ہوا تھا اور اِس سدرۃ المنتہیٰ سے مبدِع اور مبدَع کا پیکرِ نورانیت مراد ہے۔''عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى''(۵۳:۱۵)، اُسی سدرۃ المنتہیٰ کے قریب جنّت الماویٰ ہے، یہ کلمۂ باری ہے۔''اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى''(۵۳:۱۶)، جس وقت کہ ڈھانکتا تھا بیری کو جو کچھ ڈھانک رہا تھا۔ یعنی اِس درخت کو یا اُس نورِ عقل کو بار بار چھپالیا جاتا تھا۔''مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى''(۵۳:۱۷)، نگاہ نے کجی نہیں کی اور نہ زیادہ بڑھ گئی، یعنی حضورؐ کی نگاہ اُس دیدار کی طرف رہی اور وہاں سے آگے پیچھے نہیں ہٹی۔''لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى''(۵۳:۱۸)، اُس مقام پر پیغمبرِ اکرمؐ نے اپنے ربّ کی عظیم آیات کو یعنی عظیم معجزات کو دیکھا، وہ مقام ایسا تھا کہ اُس میں عظیم عظیم آیتوں کا یعنی عظیم عظیم معجزات کا یا نشانیوں کا مشاہدہ ہوتا تھا۔''اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى''(۵۳:۱۹۔۲۰)، کیا پس دیکھا تم نے لات اور عزیٰ کو اور تیسرے منات کو۔ یہ بت ہیں اور معبودانِ باطل، تو خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے کہ جو خدائے برحق ہے، اُس کا معجزہ اور رہنمائی یہ ہے جس کا ذکر ہوا، تو کیا جو معبودانِ باطل ہیں وہ بھی ایسے معجزات کرتے ہیں، ایسی نشانیاں دکھاتے ہیں، تو اِس سورۂ نجم میں سے یہاں تک ہم نے بیس آیتوں کی وضاحت کی اور اِس سورے کا اہم حصہ یہ ہے، اور اِس میں چونکہ معراج کے واقعات بیان ہوئے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ واقعات بہت ہی عظیم ہیں یعنی اِن کی یہ تاویل وحکمت نہایت ہی اہم ہے اور اِس پر ہمیں غور وفکر کرنا چاہئے، سوچنا چاہئے اور اپنے دوسرے مسائل کو اِن کی روشنی میں حل کرنا چاہئے، اور اِس سلسلے میں اگر

کوئی سوال ہوتو وہ بھی پوچھا جاسکتا ہے۔اب میں آپ کے کسی سوال کے لئے انتظار کروں گا۔

سوال: [(شہناز سلیم ہونزائی) سر! آپ نے جو فرمایا کہ وحی متلو اور غیر متلو، اِس کے ذرا لفظی معنی بھی درکار ہیں اور دوسرے یہ کہ غیر متلو میں الفاظ خود رسولؐ کے اپنے ہیں۔سر! قرآن کے بارے میں بھی شاید جو آخری طور کی (interpretation) ہیں اُس میں ایسا فرماتا گیا ہے کہ وہ بھی رسولؐ کے اپنے (expression) ہیں ایک طرح سے اور اُن کے اپنے الفاظ ہیں، تو اِس کو ذرا سا واضح کریں]۔

جواب: میں نے قرآن اور حدیث کے درمیان جو فرق ہے، اُس کو بیان کرنے کے لئے دوسرے حضرات کے اقوال کو پیش کیا تھا، اور وہ دو طرح سے بتایا تھا۔ایک تو یہ بتایا تھا کہ قرآن اور حدیث میں فرق یہ ہے کہ قرآن اُس کلامِ الٰہی کا نام ہے جس کے الفاظ بھی اور معنی بھی خدا کی طرف سے ہیں، اور حدیث اِس آیت کی روشنی میں، حدیثِ صحیح ایسے کلام کا نام ہے کہ جس کے الفاظ رسولؐ کے اپنے ہیں اور معنی خدا کی طرف سے ہیں اور معنی میں وہ قرآن ہی کی طرح ہیں۔ایک تو یہ بتایا تھا اور دوسرا یہ کہا تھا کہ وحیٔ متلو یعنی وہ وحی جو کلامِ الٰہی کے طور پر پڑھی گئی اور وحیٔ غیر متلو یہ کہ وہ وحی نہیں پڑھی گئی، کسی اور موقع کے لئے یا حضورؐ کی ذاتی ہدایت کے لئے یا حضورؐ کی مدد کے طور پر کہ وہ اِس قوت سے اور اِس کلام کی روشنی میں یا تو اپنے لفظوں میں قرآن کی تشریح کریں یا لوگوں کو ہدایت دیں تو یہ رسولؐ پر دارومدار رکھتا تھا اور اِس کے لئے رسولؐ پابند نہیں تھے کہ کیوں اُسی وقت اُس کلام کو خداوندِ عالم کے فرمان کے طور پر پیش نہیں کیا۔ یہ قرآن اور حدیث کے درمیان فرق کی ایک بات ہوئی اور اِس سلسلے میں ایک اور نکتہ ہے، یہ کہ حدیثِ قدسی کو آپ دیکھتے ہیں: ''عَبْدِیْ اَطِعْنِیْ اَجْعَلْکَ مِثْلِیْ حَیّاً لَا تَمُوْتُ'' یہ تو بالکل لفظ بھی اور معنی بھی خدا کی طرف سے ہیں۔اِس میں رسولؐ کے الفاظ نظر نہیں آتے ہیں، اِس کے لئے کہا گیا کہ ایسا کلام جو داخلِ قرآن نہیں ہے، اِس لئے کہ اُس میں سے کچھ تو اگلی کتابوں میں سے ترجمہ کے طور پر ہیں یا رسولؐ کی ذات سے اِس کا ظہور ہے اور بہر معنی وہ داخلِ قرآن نہیں ہیں، تو یہ بات بھی قابلِ غور ہے۔ پھر اِس کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ بعض اگلی آسمانی کتابوں میں سے ہیں، لہٰذا اِس کو داخلِ قرآن نہیں کیا گیا۔ جیسے کہ: ''قَالَ کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ'' تو یہ حدیثِ قدسی ہے، اندازِ بیان قرآن کی طرح ہے لیکن یہ حدیث کی دوسری قسم ہے۔ بہر حال یہ سب چیزیں ہماری یاداشت میں ہونی چاہئیں۔ یہ ہے متلو اور غیر متلو کا مطلب کہ وحیٔ متلو کا مطلب ہے کہ اُسی وقت پڑھا گیا اور غیر متلو نہیں پڑھا گیا، اُس کو رسولؐ نے اپنی ذات میں رکھا اور اپنی ذات کے لئے سرمایہ بنایا تاکہ بوقتِ ضرورت اُسی سے ہدایت کریں اور اپنے لفظوں میں۔نزولِ قرآن سے قبل بھی کچھ ایسی مثالیں ملتی ہیں، مثال کے طور پر زبور کو لیجئے کہ زبور میں کب یہ ہے کہ خدا یہ فرماتا ہے اور خدا کا یہ حکم ہے، اُس میں شروع سے لے کر آخر تک بس حضرت داودؑ کا کلام ہے۔ پھر بھی اُس کی بابت یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ کلامِ الٰہی ہے، وحی ہے، تو یہ انبیاء و اولیاء علیہم

السّلام کی خدا سے انتہائی قربت کی وجہ سے ہے۔

سوال: [(امین رحمانی) سر! اِس آیت کی روشنی میں آپ نے وضاحت کی جس میں خدا نے فرمایا کہ تمہارا صاحب وہ نہ ہی رُوحانیت کے راستے سے بھٹکا اور نہ ہی کوئی غلط راہ لے لی اُس نے (۵۳:۲)۔ سر! جب آنحضرتؐ رُوحانیت کی راہ پر گامزن تھے اور حق ہی کی طرف جا رہے تھے تو اُس میں بھٹکنے کی اور راہ سے الگ ہونے کی کیا تاویل ہے اور اِس میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟]

جواب: اِنہوں نے جیسا سوال کیا آپ سب عزیزوں نے سن لیا اور یہ کہتے ہیں کہ یوں کہنے کی ضرورت بھی کیا تھی کہ راہِ رُوحانیت پر تو چلتے رہے اور کامیابی سے چلے اور کیا اِس میں کسی کو شبہ ہو سکتا تھا وغیرہ۔ اِس میں یہ ممکن نظر آتا ہے کہ سردارِ رسولؐ جو حبیبِ خدا تھے، اُنہوں نے انتہائی کامیابی سے اِن منازل کو طے کیا، جہاں بہت سے لوگ راہِ رُوحانیت پر آگے بڑھتے ہیں اور پھر بہت سے مسائل بھی سامنے آتے ہیں، تو گرتے پڑتے بھی کوئی آگے سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ لیکن اُس میں البتہ فرق ہے اور فرق یہ کہ جو ہادیٔ برحق ہے وہ تو انسانِ کامل ہے اور انتہائی کامیابی کے ساتھ وہ آگے سے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور پھر دوسری وجہ اِس میں یہ بھی ہے کہ کفّار جس طرح، طرح طرح کی باتیں بناتے تھے اور کبھی تو حضورؐ کو مجنون قرار دیتے تھے، کبھی مسحور جادو کیا ہوا وغیرہ، تو اِن الزامات کی تردید بھی مراد ہے اور یہ ضروری ہے کہ زبانِ قدرت سے رسولؐ کی شان کے بارے میں ذکر کیا جائے تا کہ مومنین کو یقین ہو اور اُن کے یقین میں اضافہ ہو۔ ایک تیسری وجہ اِس میں یہ ہے کہ یہاں پر یہ ارشاد سفرِ رُوحانیت کے اختتام کو ظاہر کرتا ہے، جیسے دوسرے ارشادات سے ظاہر ہے کہ یہ منزلِ مقصود تھی اور سفرِ رُوحانیت کی انتہا، اِس لئے ایسا فرمانا چاہئے تھا۔

سوال: [(یازمین شیرولی) سر! آپ نے بتایا کہ سدرۃ المنتہیٰ کے قریب جنّت الماویٰ ہے (۵۳:۱۵)، تو اِس کی تاویل کے بارے میں تھوڑی سی وضاحت کریں؟]۔

جواب: سوال آپ عزیزوں نے سن لیا اور سوال جنّت الماویٰ کے بارے میں ہے۔ جنّت باغ کو کہا جاتا ہے، ماویٰ ٹھکانے کا نام ہے تو دونوں لفظوں کو ملا کر یہ معنی بنتے ہیں، وہ جنّت یا وہ باغ یا وہ بہشت جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھکانے کی حیثیت سے ہے، تو اِس کی مراد کلمۂ باری ہے اور پیر ناصرِ خسروؒ نے جہاں اُس بہشت کی تاویل کی ہے جس کے نیچے چار نہریں یا کہ چار دریا بہتے ہیں، اُس بہشت سے کلمۂ باری کو مراد لیا ہے یا کہ اُس بہشت کی تاویل کلمۂ باری سے کی ہے۔ چنانچہ کلمۂ باری بہشت ہے اور یہاں جنّت الماویٰ سے وہی کلمۂ باری مراد ہے اور جس طرح اِس سورہ کے ارشادات سے ظاہر ہے کہ رسولِ اکرم کو مقامِ معراج پر بڑی بڑی آیات دکھائی گئی تھیں یا کہ بڑے بڑے معجزات کا ظہور ہوا تھا تو اِن بڑے معجزات کے سلسلے میں کلمۂ باری کا آنا لازمی ہے، تو یہ آپ کے سوال کا جواب ہے۔

سوال: [(امین رحمانی) سر! سفرِ رُوحانیت ایک طویل سفر ہے اور اُس میں کافی لمبا عرصہ ہوتا ہے اور جو بھی مشاہدات ہیں، تو اُس میں جیسا آپ نے قریۂ ہستی اور انبعاث کے سلسلے میں فرمایا ہے کہ اُس کو نفس کلی تک یعنی سو (۱۰۰) کے عدد سے کہا گیا کہ اُس میں کافی لمبا عرصہ تھا اور پھر تاریخی طور پر ہم کو یہ ملتا ہے کہ واقعۂ معراج کسی ایک شب میں ہوا، کیا اِس سے اُس واقعہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا یا یہ واقعہ اُسی شب کو پیش آیا؟ اِس کی ذرا وضاحت کریں؟]۔

جواب: سوال جیسا کیا گیا وہ آپ نے سن لیا، جواب اِس کا یوں عرض ہے کہ سفرِ رُوحانیت ایک لمبا سفر ہے جو انسانِ کامل کی زندگی کے ایک بڑے حصے پر پھیلا ہوا ہے اور اگر اُس کو پھیلایا جائے، تو ممکن ہے کہ پچاس ہزار برس پر پھیل جائے۔ تاہم انسانِ کامل کی زندگی کے ایک بڑے حصے پر پھیلی ہوئی رُوحانیت جا کر ایک شب کو یا ایک دن کو مکمل ہو جاتی ہے اور جو اصل واقعۂ معراج ہے، وہ بہت ہی کم وقت کی بات ہے۔ وہ ایک مظاہرہ ہے، وہ ایک معجزہ ہے اور واقعاً تاریخ میں معراج کے بارے میں جتنے وقت کو ظاہر کیا گیا ہے وہ صحیح ہے، اُسی کے مطابق یہ واقعہ درست ہے یعنی اتنے عرصے میں وہ واقعہ مکمل ہو سکتا ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ ساتھ جیسا کہ اِدھر اشارہ ملا کہ معراج دوسری دفعہ بھی پیش آسکتی ہے اور کئی دفعہ بھی۔

نیز ایک نکتہ اگرچہ یہ نکتہ اِس جواب میں نہ بھی آئے لیکن معلومات کے طور پر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایک روایت میں ہے کہ حضورِ اکرمؐ کی معراج اگرچہ صرف ایک ہی صبح کے مختصر وقت میں ختم ہوئی تھی عالمِ مادّیت کے اعتبار سے لیکن عالمِ رُوحانیت میں حضورؐ کو اتنا وقت ملا تھا کہ اُس میں اٹھارہ برس کی مدّت تھی، یہ ایک روایت ہے۔ اِس میں عجب نہیں ہے کہ اگر رُوح عالمِ امر میں خود کو بیدار پائے تو وہ وقت بڑا لمبا ہو اور اِس کے ساتھ ساتھ دنیا کا جو وقت ہے وہ بہت مختصر وقت ہو۔ اِس میں سوچنا چاہئے کہ کیوں ایسا ہے کہ ایک ہی وقت کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں کہ وہ وقت دنیا میں صرف ایک گھنٹے کا وقت ہے اور وہی وقت اگر عالمِ امر میں پھیلائیں تو اٹھارہ برس کی مدّت ہے۔ یہ درست ہو سکتا ہے کیونکہ قرآن میں کچھ ایسی آیات بھی ہیں جن میں اشارہ ملتا ہے کہ جب انسان اِس دنیا سے عالمِ رُوحانیت میں چلا جائے گا تو اُس وقت وہ پیچھے کو دیکھے گا اور دنیا میں جس مدّت تک وہ رہا ہے اُس کا اندازہ کرے گا، اُس کو لگے گا کہ وہ دن کے ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں رہا تھا دنیا میں یعنی دنیا کی عمر اُس کو بہت ہی مختصر لگے گی۔

اِس سلسلے میں ہم ایک چیز کو دیکھتے ہیں وہ یہ کہ گھڑی کے ڈائل میں ایک سوئی ہے گھنٹے کی یا منٹ کی جو گھومتی ہے، ایک گھنٹے میں منٹ کی سوئی جس طرح گھومتی ہے، دیکھیں کہ مرکز کی طرف دیکھیں اور نوک کی طرف دیکھیں، ایک ہی مدّت میں نوک کتنی مسافت کو طے کرتی ہے اور مرکز کی طرف جو حصہ ہے وہ کتنی مسافت کو طے کرتا ہے، حالانکہ دونوں کے لئے ایک ہی وقت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِس میں ایک مثال ہے کہ دنیا کا وقت بہت جلد گزرتا ہے اور آخرت کا وقت لامحدود

ہے،تو چنانچہ رسولِ اکرمؐ جس طرح معراج کو گئے تھے، اُس میں ہوسکتا ہے کہ رُوحانی اعتبار سے بہت زیادہ وقت گزرا ہو اور جسمانی اعتبار سے اُس میں صرف ایک گھنٹے کا وقت گزر گیا ہو۔ بعض دفعہ مومن کچھ ایسے تجربات بھی کرتا ہے، ایسے خواب بھی دیکھتا ہے، وہ محسوس کرتا ہے، کہ اُس پر اُس خواب میں ایک بہت بڑا وقت گزر گیا ہے اور حالانکہ اتنا وقت نہیں گزرتا ہے جیسا کہ وہ سمجھتا ہے۔ ایسی باتیں بھی ممکن ہیں، یہ فرق اِس لئے ہے کہ ایک تو عالمِ رُوحانیت ہے جو لازمان اور لامکان ہے اور ایک عالمِ مادّیت ہے، اِس میں وقت گزرتا جاتا ہے۔ میرے خیال میں آپ کے اِس سوال کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے۔

ٹرانسکرائب: امین رحمانی نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

Click here for Audio

عنوان: سورۂ ماعون کی تاویل (کتاب: سوغاتِ دانش، صفحہ: ۷۳)

کیسٹ نمبر: Q-50 تاریخ: ۸ر مارچ ر ۱۹۸۴، کراچی

عزیزان! یا علی مدد۔

آج آپ عزیزوں کے لئے قرآنِ مقدّس کی ایک سورت کا ترجمہ اور تاویل پیش کی جاتی ہے، وہ ہے سورۂ ماعون جو قرآن کی (۱۰۷) نمبر کی سورت ہے۔ میرے خیال میں اِس سورے میں عظیم حکمتیں ہیں اور بنیادی حقیقتیں اِس میں پوشیدہ ہیں، مجھے اُمید ہے کہ آپ اِن کے سننے سے محظوظ ہوں گے اور قرآن کے سمجھنے میں اِس سے آپ کو بڑا فائدہ ملے گا۔ میں اوّل سورت کو عربی عبارت میں پڑھتا ہوں اور اُس کے بعد ترجمہ پھر تاویل پیش کی جاتی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَرَاَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ۝ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ۝ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ۝ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ ۝ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ سَاہُوۡنَ ۝ الَّذِیۡنَ ہُمۡ یُرَآءُوۡنَ ۝ وَیَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (۱۰۷:۱۔۷)۔

ترجمہ: خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ کیا تم نے اُس شخص کو بھی دیکھا جو (روزِ) جزا کو جھٹلاتا ہے۔ یہ تو وہی (کم بخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کے کھانے کی ترغیب نہیں دیتا، تو اُن نمازیوں کی تباہی ہے جو اپنی نماز سے غافل رہتے ہیں۔ جو دکھانے کے واسطے کرتے ہیں اور زکات نہیں دیتے۔

تاویل: روزِ جزا یعنی قیامت حضرت قائم صلوات اللہ علیہ سے وابستہ ہے، یعنی قرآنِ مقدّس میں جو بار بار قیامت کا ذکر آتا ہے، وہ ایک فعل ہے ایک فاعل کا اور وہ فاعل حضرت قائم القیامت صلوات اللہ علیہ ہے۔ قائم کا فعل قیامت ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ قیامت ایک صفت ہے ایک موصوف کی، اور وہ موصوف قائم ہے۔ چنانچہ قائم القیامت سے انکار کرنا روزِ جزا کو جھٹلانا ہے اور جو شخص اِسی طرح قیامت کو جھٹلاتا ہو وہ امامِ عالی مقام کو جو درِّ یتیم (یعنی گوہرِ یکتا) ہے، دھکے دیتا ہے، جبکہ امام نورِ علم کی صورت میں اُس کے ظاہر و باطن پر طلوع ہو جانے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص میں حجّت یعنی مسکین کی رُوحانی غذا کا شوق بھی پیدا نہیں ہوسکتا، کہ وہ خود بھی اِس کو کھائے اور دوسروں کو بھی اِس کی ترغیب دے۔ پس بربادی ہے اُن نمازیوں کی جو اپنی نماز کے آداب و اجزاء کی تاویلی حکمتوں سے غافل ہیں، جو دکھانے کے لئے کرتے ہیں، یعنی

نماز کے باطن کو نہیں سمجھتے ہیں اور زکات نہیں دیتے، یعنی عقلی اور رُوحانی طور پر پاک نہیں ہو سکتے ہیں۔

یتیم کی تاویل امامِ برحق ہے کیونکہ امام ہی دُرِّ یتیم یعنی گوہرِ منفرد و یکتا ہے، جبکہ یتیم کے معنی ہیں: اکیلا، لاثانی، بے نظیر۔ ''دُرَّۃٌ یَتِیْمَۃٌ'' کے معنی ہیں: قیمتی یا بے نظیر موتی۔ مسکین کی تاویل ہے حجّت، جس کے علم میں مومنین کے لئے تسکین ہے اور طعامِ مسکین سے حجّت کا علم مراد ہے جو عقلی اور رُوحانی غذا ہے۔ نیز مسکین کا مطلب یہ بھی ہے کہ حجّت ہمیشہ امامِ اقدس و اطہرؑ کے مبارک در پر بھیک مانگتا رہتا ہے، اِس صورت میں مسکین کے کھانے کی ترغیب دینا یہ ہے کہ کوئی مومن محبّت اور عشق سے امام کی اطاعت کرے، تاکہ اُس کی رُوح کو جو ایک طرح کی مسکین ہے عقلی اور رُوحانی غذا ملے۔

اِس حکمت آگین سورت کے منفی اور مثبت دو پہلو ہیں، اور مثبت پہلو یہ ہے کہ امامِ وقتؑ کی رُوحانیت اور مرتبۂ قائم القیامت کے لئے اقرار کر لیا جائے، تاکہ دُرِّ یتیم ایسے مومن کے باطن میں داخل ہو سکے اور مومن حجّت کے علم کی دولت سے مالا مال ہو جائے تاکہ اُس کی نماز عملی اور حقیقی ہو، یعنی وہ نماز کی حکمتوں سے باخبر ہو، اور پھر وہ پاکیزہ ہو کر علمی زکات دیتا رہے، یہ ہے سورۂ ماعون کی مربوط حکمت، بفضلہٖ وَ مَنِّہٖ۔

اِس میں ہم ایک ایک کر کے تمام الفاظ میں بحث کرنا چاہتے ہیں اور سب سے پہلے ہم شروع کی آیت کو لیتے ہیں۔ ''اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ'' (۱۰۷:۱) خداوندِ عالم سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پوچھتا ہے کہ آیا آپ نے اُس شخص کو دیکھا جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے۔ جھٹلانے کے بارے میں تجزیہ کیا جاتا ہے کہ یہ جھٹلانا کس معنیٰ میں ہے، دیکھیں کہ اِس سورت میں ایسے لوگوں کا ذکر نہیں ملتا کہ وہ خدا کی ہستی سے اور خیر و شر کے تصور سے انکار کرتے ہوں، جیسے کہ آپ نے پہلی بار سن لیا کہ اِس میں کچھ ایسے لوگ ہیں کہ وہ اپنے طور سے نیکی بھی کرتے ہیں اور عبادت بھی لیکن اِس کے باوجود یہ کون سا شخص ہے یا کون سے لوگ ہیں جو روزِ جزا کو جھٹلاتے ہیں۔ یقیناً یہ جھٹلانا اِس طرح سے ہے کہ روزِ جزا کی حقیقت کو نہیں سمجھتے ہیں جیسا کہ سمجھنا چاہئے، اِسی معنیٰ میں جھٹلایا جاتا ہے اور روزِ جزا کو الگ نہیں بلکہ روزِ جزا یا کہ قیامت کا جس ہستی سے تعلق ہے یا جو صاحبِ قیامت ہے اُسی سے انکار ہے اور اُسی کو جھٹلایا جاتا ہے۔

''فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ'' (۱۰۷:۲) سو یہی شخص ہے جو یتیم کو دھکا دیتا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا کافر نہیں ہے جو اہتمام سے یتیم کو دھکا دے۔ دنیا کی انسانیت میں یہ اُصول نہیں ہے، یہ قانون نہیں ہے۔ مگر ہاں! یتیم کو دھکا دینے کے معنی ہیں اور وہ یہ کہ امام منفرد و یکتا ہونے کے معنی میں یتیم ہے اور یتیم کی تاویل امام ہے، اِس لئے کہ یتیم کے معنی یکتا کے ہیں، بے نظیر کے ہیں، اور انتہائی گرانقدر کے ہیں۔ چنانچہ جب سمندر سے موتیوں کو نکالا جاتا ہے، تو اُس وقت جہاں ایک اکیلا موتی سیپ سے نکلتا ہے، تو اُس کو دُرِّ یتیم یعنی یکتا گوہر کہا جاتا ہے اور کوئی شخص امام کو اِس معنیٰ میں دھکے دیتا ہے، کہ امام کا یہ کام ہے کہ اپنی نورانیت سے ہر شخص کے باطن میں جائے، لیکن جو لوگ امام سے انکار کرتے ہیں

وہ امام کی اِس حیثیت کو، امام کی اِس نورانیت کو اور اِس رُوحانیت کو دھکے دے کر اپنے باطن سے نکال دیتے ہیں اور دیکھیں کہ پہلی آیت کا دوسری آیت کے ساتھ ربط ہے، اور ربط ہے اِس لئے کہا جاتا ہے کہ: ''فَذٰلِكَ الَّذِیْ'' پہلے کچھ فرمایا جاتا ہے، یہ کہ جو شخص قائم القیامت کے تصور کو جھٹلاتا ہے، وہی شخص امام کی تعلیمات کو جو ظاہراً و باطناً کسی انسان پر اور ہر انسان پر طلوع ہو جانے لگتی ہیں تو اُن کو وہ شخص جس کو قائم القیامت سے انکار ہے، دھکے دے کر نکالتا ہے۔

''وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ'' (۱۰۷:۳) اور جو شخص قائم القیامت کا اور امام کا تصور نہیں رکھتا ہے اور جو اِس معنیٰ میں امام کی رُوحانیت و نورانیت کو یعنی اُس کی تعلیمات کو اپنے باطن سے دھکے دے کر نکالتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ حجّت کی تعلیمات کی طرف توجہ نہیں دیتا ہے، کہ حجّت کی تعلیمات کو یہاں ''طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ'' کہا گیا ہے، تسکین دینے والے کی طرف سے رُوحانی غذا۔ یہاں مسکین کے دو معنی ہیں، ایک معنی اِس کے ہیں تسکین دینے والا اور دوسرے معنی ہیں محتاج اور یہ دونوں معنی حجّت کے لئے صحیح ہیں کیونکہ حجّت ہی اپنے رُوحانی علم سے جو امام سے حاصل کرتا ہے، مومنین کو تسکین دیتا ہے۔ نیز وہ مسکین ہے یعنی محتاج کہ ہمیشہ امام کے در پر بھیک مانگتا ہے، تو یہاں اہلِ انکار کے متعلق ارشاد ہوا ہے، کہ وہ لوگ حجّت کے علم کی طرف توجہ نہیں دیتے ہیں۔

اُس کے بعد اِسی ربط میں اِسی سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے کہ: ''فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ'' (۱۰۷:۴۔۵) دیکھئے کہ یہاں جن لوگوں کا ذکر چلتا ہے، وہ ایسے ہیں کہ نمازی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ نماز نہیں پڑھتے ہیں، وہ نماز پڑھتے ہیں، اُن کے نماز پڑھنے کا ذکر ہے، پر خداوند کہتا ہے کہ بربادی ہے یعنی اُن کے وہاں کوئی تعمیر نہیں ہے، کوئی آبادی نہیں ہے بلکہ بربادی ہے۔ ''وَیْل'' تباہی کو کہتے ہیں، بربادی کو کہتے ہیں یعنی روحانی وجود کے نہ بننے کا اشارہ ہے۔ ''فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ'' (۱۰۷:۴۔۵) تباہی ہے اُن نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں۔ نماز تو کرتے ہیں ایسا نہیں کہ نہیں کرتے ہیں لیکن وہ بے خبر ہیں، تو پھر کس معنیٰ میں بے خبر ہیں؟ وہ اِس معنیٰ میں بے خبر ہیں کہ نماز کے جو آداب ہیں، نماز کے جو ارکان ہیں، نماز کے جو اجزاء ہیں اور اُن کی جو تاویلی حکمت ہے، اُن میں جو اشارے ہیں، جو رُموز ہیں وہ نہیں جانتے اور آپ جانتے ہیں کہ نماز کے تمام آداب میں، نماز کے تمام اجزاء میں، نماز کے تمام ارکان میں امام ہی کا ذکر ہے۔ خدا و رسول نے نماز میں جیسی تاویل رکھی ہے، وہ بھی پڑھنے اور جاننے کی چیز ہے اور اگر وہاں کچھ نہ ہوتا تو خدا کو یہ اعتراض نہ ہوتا اور خدا اپنے لفظوں میں ایسے لوگوں کے لئے بربادی یا تباہی نہ کہتا۔ اگر یوں ہی نماز کے پڑھنے سے مقصد پورا ہو جاتا تو خدا کو اتنا سخت اعتراض نہ ہوتا، کہ اُس نے بربادی کے لفظ کو استعمال کیا، اِس لئے کہ خدا اور رسول نے نماز کے آداب میں اور نماز کی ہیئت میں، نماز کی صورت میں دینِ حق اور امام کے متعلق بہت کچھ اشارے کیے ہوئے ہیں۔

''اَلَّذِیۡنَ ھُمۡ یُرَآءُوۡنَ'' (۶:۱۰۷) وہ لوگ دکھاتے ہیں اور دکھانے کے لئے نماز پڑھتے ہیں۔ ''وَیَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ'' (۷:۱۰۷) اور زکات کو منع کرتے ہیں۔ ماعون کے کئی معنی ہیں، ماعون برتنے کی چیز کو بھی کہا جاتا ہے، ایسی چیز کہ اگر اُس کو استعمال کے لئے کسی کو دے دیا جائے تو اُس میں کوئی مضائقہ نہیں ہو لیکن مولا علیؑ کے ارشاد کے مطابق ماعون زکات کے لئے ہے اور زکات عقلی اور رُوحانی پاکیزگی کے معنی میں ہے۔ کیونکہ زکات کے معنی پاکیزگی کے ہیں اور اِن آیات کے ربط سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ قائم القیامت کے لئے اقرار کرنے کے نتیجے میں اور امام کی تعلیمات کو قبول کرنے کے نتیجے میں، اور حجّت کی تعلیمات کو لینے کی صورت میں، نماز کی تاویلی حکمتوں کو جاننے کے بعد اور عملی طور پر نماز کو قائم کرنے کے بعد جو صورت بنتی ہے، وہ یہ بنتی ہے کہ کوئی علمی زکات دے سکتا ہے یعنی خود پاکیزہ ہو سکتا ہے اور پاکیزگی کے لئے عقلی اور علمی زکات بھی دے سکتا ہے۔ کیونکہ آیات میں جو معنی ہوتے ہیں اور جیسا ربط ہوتا ہے، اُس کے نتیجے میں یہ معنی بنتے ہیں، تو آپ نے سنا کہ قائم القیامت کا جو تصور ہے وہ امامت کا تصور ہے، اور امامت کے ساتھ حجّت، حدودِ دین یا پیر کا تصور ہے اور پھر نماز گویا ایک کتاب ہے، کہ اُس کے اندر بہت سارے بھید ہیں، بہت ساری تاویلات ہیں جن کا جاننا بہت ہی ضروری ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ زکات کا ذکر آخر میں آتا ہے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ یہ علمی زکات ہے اور کوئی بھی شخص علمی زکات کے قابل اُس وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ اِن تمام شرطوں کو پوری کرتا ہے، تو آج کی اِس کلاس میں یا آج کی اِس علمی گفتگو میں یا آج کے اِس دَرس میں جو اہم نکات ہیں، وہ تکذیب سے متعلق ہیں اور لفظ یتیم کی تاویل ہے، کہ لفظ یتیم قرآن میں جہاں کہیں بھی مذکور ہو اُس کی تاویل امام ہے اور آپ کو یہ تاویل قانون معلوم ہے کہ ساری حقیقتیں امام میں جمع ہو جاتی ہیں، اِس لئے کہ ساری حقیقتیں مثالوں میں پھیل جاتی ہیں اور پھر آخر میں تاویلی طور پر جمع ہو جاتی ہیں۔ حقیقتیں مثالوں میں پھیل جاتی ہیں اور ممثولات میں جمع ہو جاتی ہیں۔ کائنات کے ظاہر و باطن کا یہی قانون ہے کہ چیزیں ایک طرف سے پھیل جاتی ہیں اور پھر دوسری طرف سے جمع ہو جاتی ہیں، بعض دفعہ کسی بھی نو آموز کو تعجّب ہو سکتا ہے کہ تاویل کرنے والا ہر بار امام ہی کی بات کرتا ہے۔ اِس میں تعجّب کی کون سی بات ہے، قانون ہی یہی ہے کہ ہر چیز کا ایک سرچشمہ ہوا کرتا ہے، اُس سرچشمے سے چیزیں پھیل جاتی ہیں پھر دوسری طرف سے وہیں پر سب چیزیں یکجا ہو جاتی ہیں، اِس لئے قرآن میں جتنی مثالیں ہیں اُن تمام کا سب سے اعلیٰ ممثول ایک ہی ہے۔ جیسے قرآن خود ہی کہتا ہے کہ خدا نے حقیقت کو یعنی حقیقتِ اعلیٰ کو طرح طرح کی مثالوں میں بیان فرمایا ہے لوگوں کو سمجھانے کے لئے (۴۳:۲۹)، تو قرآن کے شروع سے لے کر آخر تک جتنی مثالیں ہیں اُن سب کا ممثول ایک ہی ہے، اور اِسی لئے ارشاد ہوا ہے کہ: ''وَکُلَّ شَیۡءٍ اَحۡصَیۡنٰہُ فِیۡۤ اِمَامٍ مُّبِیۡنٍ'' (۱۲:۳۶)، اور ہم نے ہر عقلی اور رُوحانی چیز کو یا کہ ہر علمی چیز کو یا کہ ہر حقیقت کو امامِ مبین میں گھیر کر رکھا ہے، اور دوسری طرف سے ارشاد ہوتا ہے کہ: ''وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُہٗ'' (۲۱:۱۵)، کوئی چیز

ایسی نہیں ہے کہ جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں'' وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ''(۱۵:۲۱)،اور ہم اُن خزانوں سے اُس چیز کو یا اُن چیزوں کو نازل نہیں کرتے ہیں، مگر لوگوں کے علم کے مطابق ،لوگ جتنا جانتے ہیں، جس قدر اُن میں علمی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، اُس کے مطابق ہم اپنے خزانوں سے اُن کو کوئی چیز نازل کرتے ہیں ۔ اِس لئے آپ بزرگانِ دین کی کتابوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ جب ارکانِ اسلام کی تاویل فرماتے ہیں تو بار بار ایک ہی حقیقت کو بیان کرتے ہیں، وہ ہر چیز کی تاویل سے امامؑ کی ہستی کو بتاتے ہیں اور امامؑ کے حدود کو بتاتے ہیں ۔مثلاً طہارت کو لیجئے ،اذان کو لیجئے ،نماز کے آداب کو لیجئے ،رُکوع کو لیجئے ،سجود کو لیجئے ،قیام کو لیجئے ،قعود کو لیجئے ،سلام کو لیجئے ،قبلہ کو لیجئے ،مسجد کو لیجئے ،قرآن کو لیجئے ،آسمان اور زمین کی تاویل کیجئے ،بہشت کی تاویل کیجئے ،غرض یہ کہ کوئی چیز نہیں ہے اسلام کی جس کی تاویل میں پیغمبر اور امام کا ذکر نہ ہو۔

اِس سلسلے میں کتابِ وجہ دین آپ کے لئے بڑی ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے، آپ نے پہلے صرف وجہ دین کتاب کو پڑھی تھی ،اب آپ براہِ راست قرآن کی تاویل کر رہے ہیں ۔ دیکھیں کہ وجہ دین کس طرح یاد آتی ہے، کہ اُس کی ہر بات ،ہر تاویل ،ہر بیان کس قدر صداقتوں سے اور حقیقتوں سے بھرپور ہے، جب آپ کسی سورے کو پڑھتے ہیں تو اُس میں اُس کی ہر آیت میں بار بار امامِ زمان کا تذکرہ آتا ہے، مقامِ عقل پر، مقامِ رُوحانیت پر، عالم ذرّ میں، قیامت کے موضوع میں ، جبرائیل ،میکائیل ،اسرافیل اور عزرائیل کے تذکرے میں امام ہی کا ذکر آتا ہے، اعمال نامے میں اور عرش، کرسی، قلم ،لوح میں ،تو پھر میں عرض کرتا ہوں کہ اِسی معنیٰ میں کہا گیا فرمایا گیا کہ:''وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنَاهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ'' (۳۶:۱۲)۔کوئی مومن اِس آیت کے مفہوم کو یوں ہی نہ لے کہ ہر چیز امامِ مبین میں ہے، اُسے جاننا چاہئے کہ کون سی چیز اور کس قسم کی چیز عقلی چیزیں ، رُوحانی چیزیں ،علمی چیزیں ،اسلام کی چیزیں ،قرآن کی چیزیں ،دین اور حقیقت کی چیزیں ، دونوں جہاں کی چیزیں ،خدا کی خدائی کی چیزیں ،تمام چیزیں ،تمام اہم چیزیں اور تمام ازلی اور ابدی چیزیں ،مکان اور لامکان کی چیزیں ، کیونکہ یوں ہی اِس کے کہنے میں کچھ مطلب نہیں بنتا ہے کہ تمام چیزیں امامِ مبین میں ہیں ۔آخر تو سمجھنا چاہئے کہ چیزوں کی نوعیت کیا ہے اور اِس میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ اِس سورہ کے دو پہلو ہیں ،ایک منفی پہلو ہے اور ایک مثبت پہلو ہے، یہ بہت عمدہ بات ہے آپ ہمیشہ ذہن نشین کر لیں کہ آیت یا تو منفی پہلو سے ہوتی ہے یا مثبت پہلو سے اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ سورہ کس پہلو سے ہے، منفی پہلو سے ہے ۔اگر منفی پہلو سے ہے تو پھر آپ نے مثبت پہلو کو بھی اِسی کی روشنی میں بیان کرنا ہے، یعنی یہاں یہ ذکر ہے کہ اُن لوگوں کو کیا نقصان ہوتا ہے جو قائم سے انکار کرتے ہیں ، جو امام کے نور کو دھکے دے کر اپنی ہستی سے نکالتے ہیں ، جو حجّت کی تعلیمات کی طرف توجہ نہیں دیتے ہیں ، جو اپنی نماز کی تاویلی حکمتوں سے غافل ہیں ، جو ریاکاری کے طور پر نماز پڑھتے ہیں ، جو زکات نہیں دیتے ہیں تو یہ منفی پہلو ہوا ۔اب اِس کا مثبت پہلو بھی بیان کرنا چاہئے، صرف یہی سورہ نہیں بلکہ قرآن کی بہت ساری آیتیں ہیں کہ اُن میں بھی یہی اُصول کارفرما ہے، کہ یا تو کسی آیت

کو منفی پہلو سے بیان کیا جاتا ہے یا مثبت پہلو سے، تو جس پہلو سے بیان کیا گیا ہے، اُس کے برعکس پہلو کو بھی آپ نے بیان کرنا ہے اور حکمت اِسی چیز کا نام ہے اور یہاں اِس کی مثال یہ ہے کہ جو لوگ قائم القیامت کو پہچانتے ہیں، تو وہ قیامت کی تصدیق کرتے ہیں، روزِ جزا کی تصدیق کرتے ہیں اور وہ امام کو اپنے اندر آنے دیتے ہیں، کہ امام کا نور اور امام کی رُوح ایسے مومن میں داخل ہو جاتی ہے کہ امام دُرِّ یتیم ہے اور پھر اُن لوگوں کو امام کے حدود کا جو علم ہے، اُس علم سے عشق پیدا ہو جاتا ہے، محبّت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ لوگ نماز کی حکمتوں کو جانتے ہیں، وہ نماز کے بھیدوں کو جانتے ہیں، وہ عملاً عبادت کرتے ہیں اور حقیقی نماز قائم کرتے ہیں اور وہ صحیح معنوں میں عقلی اور علمی زکات دیتے ہیں، یہ اِس کا مثبت پہلو ہے اور جہاں امام کو دُرِّ یتیم کہا گیا ہے، تو آپ جانتے ہیں کہ درِّ یتیم کا کیا مطلب ہوتا ہے، وہ گوہرِ عقل ہے۔ وہ واقعاً منفرد ہے، وہ واقعاً یکتا ہے، وہ واقعاً گرانقدر ہے اور بے نظیر ہے۔ اِسی کے ساتھ میں اِس صفحے کو رکھتا ہوں اور آپ عزیزوں میں سے کسی کا کوئی سوال ہو تو اُس کے لئے وقت دیا جاتا ہے۔ شکریہ، یا علی مدد۔

سوال: (ماعون سے کیا مراد ہے، عام استعمال کی چیزیں تو عام استعمال سے مراد کھانے پینے کی چیزیں ہیں یا کچھ اور)؟

جواب: ماعون کے کئی معنی ہیں۔ ایک تو اِس کے معنی ہیں برتنے کی چیز اور اِس برتنے کی چیز سے بہت سی چیزیں مراد ہو سکتی ہیں، مثلاً کوئی برتن کہ وہ استعمال کے لئے کوئی طلب کرتا ہے اور استعمال کر کے آپ کو دیتا ہے، اِس میں بہت ساری چیزیں آتی ہیں، لیکن ماعون کے دوسرے معنی زکات کے ہیں، تو ہم نے یہاں اِس کے ترجمے اور تشریح میں یا تاویل میں زکات کو لیا ہے۔ اِس کے معنی میں اختلاف ہے اور اِس اختلاف کی وجہ سے اِس کے بہت سے معنی ہیں، مگر اِس کے دو معنی مشہور ہیں: ایک یہ کہ برتنے کی چیز اور دوسرے معنی ہیں زکات، تو زکات کے معنی یہاں زیادہ مناسب ہیں، چونکہ ربط سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں علمی زکات کی صورت بنتی ہے۔ منفی پہلو سے بھی اور مثبت پہلو سے بھی زکات کے معنی بنتے ہیں، منفی پہلو سے اِس لئے کہ جو لوگ قائم کو اور امام کو نہیں پہچانتے ہیں، تو وہ زکات نہیں دے سکتے ہیں، علمی زکات، اور مثبت پہلو سے اِس لئے زکات کے معنی صحیح ہیں کہ وہ پھر علمی زکات کو دے سکتے ہیں اور سب سے آخر میں علمی زکات ایک شخص کے لئے بہت بڑی چیز بنتی ہے، اِس لئے ماعون کے معنی زکات کے زیادہ صحیح ہیں، مولا علیؑ کا یہ قول ہے اور مفسّرین نے بہت سے صحابہ کبار کا حوالہ دیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ حوالہ بھی دیا ہے کہ مولا علیؑ کا قول ہے کہ ماعون سے زکات مراد ہے، اِس لئے آپ کے اِس سوال کا جواب مختصراً یہ کہ ماعون کے اصل معنی زکات کے ہونے چاہئیں۔

سوال: [(امین رحمانی) سر! یہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ صلوٰۃ قائم کرنے کے معنی دعوت کو قائم کرنا ہے، تو اِس سلسلے میں یہاں آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ دعوت تو کرتے ہیں اگر ہم اِس معنی کو لیں، دعوت تو کرتے ہیں لیکن اپنی دعوت سے غافل ہیں یا دکھاوے کی دعوت کرتے ہیں، تو کیا اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ دعوتِ حق نہیں ہے وہ اپنی طرف سے دعوت کرتے ہیں؟]

جواب: یہ صحیح ہے کہ نماز یا صلوٰۃ کی ایک تاویل دعوت ہے اور دنیا میں بہت سے لوگ دعوت کرتے ہیں لیکن وہ لوگ اپنی دعوت سے غافل ہیں۔ غافل اِس لئے ہیں کہ وہ نہیں سمجھتے ہیں، نہیں جانتے ہیں کہ اُن کی دعوت کی اہمیت کیا ہے اور وہ حق ہے یا باطل ہے اور کس کی طرف دعوت کر رہے ہیں، اِس لئے وہ اپنی دعوت کو نہیں سمجھتے ہیں اور جو دعوت وہ کرتے ہیں وہ دکھاوے کی دعوت ہے، حقیقی اور عملی دعوت نہیں ہے کیونکہ حقیقی اور عملی دعوت صرف ایک ہی ہے جو امامؑ کے تحت اور اُس کی نگرانی میں ہے۔ لہٰذا یہ تاویل صحیح ہے کہ نماز سے دعوتِ حق مراد ہے اور یہاں جو لوگ جس طرح نماز کو اپنی اصلیت کے ساتھ قائم نہیں کر پا رہے ہیں، تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک طرح کی دعوت تو کرتے ہیں لیکن وہ حقیقی دعوت نہیں ہے، اِس لئے نہیں ہے کہ وہ اِس کو نہیں سمجھتے ہیں۔ دعوت کے مقصد کو اگر سمجھتے اور کس کی طرف دعوت کرنی چاہئے، اِس کو جانتے تو اُن کی دعوت صحیح ہوتی، یہ آپ کے اِس سوال کا صحیح جواب ہے۔

سوال: [(امین رحمانی) سر! آپ نے دُرِّ یتیم کی یہ تاویل بتائی کہ وہ گوہرِ عقل ہے اور آپ نے اپنے پچھلے لیکچروں میں یہ فرمایا ہے کہ عقل کے مقام پر یا گوہرِ عقل کے مقام پر ہر چیز کا عملی مشاہدہ ہوتا ہے یا مظاہرہ کیا جاتا ہے، تو سر! اِس سلسلے میں اِس میں کیا تاویل ہوگی کہ یہ مظاہرہ کس طرح سے ہوگا جبکہ امام کا گوہرِ عقل کس طرح مظاہرہ کرے گا کہ اُس کو دھکا دیا جاتا ہے؟ اِس کی کوئی تاویل ہے سر)؟

جواب: اِنہوں نے جس طرح سے پوچھا آپ نے غور سے سن لیا، تو یہ اُس حقیقت کی بنیادی یا ابتدائی صورت ہے اور مشاہدے کے مقام تک جانے کی نوبت ہی نہیں آتی ہے، پر وہ اِس چیز کو یعنی گوہرِ عقل کو ابتدا ہی میں دھکے دے کر نکالتے ہیں۔ جیسا کہ ہمارے پاس ایک اُصول ہے فلسفے کا، یہ کہ ایک واقعہ ہوتا ہے بحدِ قوت اور ایک واقعہ ہوتا ہے بحدِ فعل، تو یہ بحدِ قوت ایسا کرتے ہیں اور بحدِ فعل اِس کی نوبت نہیں آتی ہے۔ مثلاً امامؑ اپنی تعلیمات کے ذریعے سے انسانوں کے باطن میں آنا چاہتا ہے لیکن وہ لوگ اِن تعلیمات سے انکار کرتے ہیں اور اِس سے نفور ہو جاتے ہیں پھر نتیجے کے طور پر گویا وہ لوگ امام کو دھکے دے کر نکالتے ہیں اور وہ اِس گوہرِ عقل کی دولت سے، اِس کے خزانوں سے، اِس کے فائدوں سے محروم رہ جاتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ یہ کام بحدِ قوت ہوتا ہے بحدِ فعل نہیں، یہ آپ کے اِس سوال کا جواب ہے۔

ٹرانسکرائب: امین رحمانی نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر